محرم الحرام ۱۴۴۶ھ
جولائی ۲۰۲۴ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی
بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

خاندانی اِستحکام کے اُصول
خطبۂ نکاح کی روشنی میں
حافظ عاطف وحید

داعی رجوع الی القرآن، بانی تنظیم اسلامی
ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ
کے دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القرآن
ترجمہ و مختصر تفسیر

کی شہرۂ آفاق پزیرائی اور مقبولیت کے بعد اب پیش ہے:

مختصر
بیانُ القرآن
ترجمہ مع منتخب حواشی

امپورٹڈ میٹ پیپر ❁ مضبوط مراکو جلد ❁ 1248 صفحات

~~4500/-~~ روپے کے بجائے
صرف -/2200 روپے میں

فری ہوم ڈیلیوری کے ساتھ

رمضان پیکج کے تسلسل میں

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور
36-K، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)
maktaba@tanzeem.org
0301-1115348

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

جلد : 73

شمارہ : 7

محرم الحرام 1446ھ

جولائی 2024ء

فی شمارہ : 50روپے

سالانہ زرِتعاون: 500روپے

مُدیر: حافظ عاکف سعید

مجلس ادارت: ایوب بیگ مرزا، خورشید انجم

نائب مُدیر: حافظ خالد محمود خضر

ادارتی معاون: حافظ محمد زاہد، محمد خلیق

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور 54700، فون: 3-35869501

ای میل: maktaba@tanzeem.org، 0301-111-5348

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

رابطہ برائے ادارتی امور: (042)38939321

publications@tanzeem.org

ویب سائٹ: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: ''دارالاسلام'' ملتان روڈ چوہنگ لاہور

(پوسٹل کوڈ 53800) فون: 78-(042)35473375

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال — 5

یومِ تکبیر اور تکبیرِ ربّ کے تقاضے! — خورشید انجم

بیانُ القُرآن — 9

سُورۃُ الفَجر + سُورۃُ البَلَد — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

حسنِ معاشرت — 27

خاندانی استحکام کے اصول — حافظ عاطف وحید

سالِ نو مبارک — 45

محرم الحرام: نئے ہجری سال کا آغاز — ڈاکٹر محمد نجیب قاسمی سنبھلی

ارضِ فلسطین — 50

نوجوان مسلم اور مسئلہ فلسطین — ریان بن نعمان اختر

مُرادِ رسولؐ — 57

خلیفہ ثانی سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ — سیدہ حفظہ احمد

تذکّر و تدبّر — 61

یہود و نصاریٰ کی حقیقت — سعد عبداللہ

دعوت و عزیمت — 65

فریضۂ اقامتِ دین اور میرا گھر — عبدالرؤف

انوارِ ہدایت — 72

خدمتِ خلق — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

دعوتِ فکر — 78

موجودہ دور میں اہلِ ایمان کی ذمہ داری — ممتاز ہاشمی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

یومِ تکبیر اور تکبیرِ ربّ کے تقاضے!

۲۸ مئی ۲۰۲۴ء کو ہم نے قومی سطح پر یومِ تکبیر منایا ہے۔ کہنے کو تو ''تکبیر'' ایک لفظ ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے اندر معانی کا ایک سمندر ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم بڑی سے بڑی حقیقت کو بھی ایک رسم بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ جیسے اقبال نے کہا ؎

رہ گئی رسمِ اذاں' رُوحِ بِلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا' تلقینِ غزالی نہ رہی

تکبیر کے حوالے سے بھی وہ روح تکبیر نکل گئی ہے' صرف اس کے الفاظ رہ گئے ہیں۔ ذرا سوچئے کہ ایک مجاہد جب نعرۂ تکبیر بلند کرتا ہے تو اس کی کیا کیفیت ہوتی ہے؟ پھر اس کا تقابل کریں کہ ہم دن میں کم از کم پانچ بار اذان میں تکبیر سنتے ہیں لیکن ہم پر اس کے اثرات مرتّب کیوں نہیں ہوتے؟ سورۃ المدثّر کی ابتدائی آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو فرمایا: ﴿قُمۡ فَاَنۡذِرۡ ۪ۙ﴿۲﴾﴾ ''اُٹھیے (اب کھڑے ہو جایئے) اور لوگوں کو خبردار کیجیے!'' یہ کارِ رسالت کی وہ کٹھن ذمہ داری تھی جو آپ ﷺ پر ڈالی جا رہی تھی۔ پہلا قدم انذار ہے' تبشیر کا معاملہ بعد میں آتا ہے۔ درحقیقت اُس وقت کے عرب معاشرے میں تبشیر کا کوئی محل و مقام ہی نہیں بنتا تھا' بلکہ اُنہیں ڈرایا جا رہا ہے کہ شرک کے جس راستے پر تم چل رہے ہو' یہ جہنم کے گڑھے کی طرف لے کر جا رہا ہے۔ پھر فرمایا کہ کھڑے ہو جایئے ''اور اپنے ربّ کو بڑا کیجیے!'' عموماً اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے کہ ''اپنے ربّ کی بڑائی بیان کیجیے!'' بڑائی بیان کرنے کے تین درجے ہیں: سب سے پہلے انسان اپنے شعور میں' ذہنی اور قلبی طور پر اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا قائل ہو۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ ربّ کی کبریائی کا اظہار و اعلان ہو۔ تیسرا درجہ یہ ہے کہ ربّ کی کبریائی والے نظام کے نفاذ اور قیام کی کوشش کی جائے۔ اللہ تعالیٰ کی ایک حکومت اور بادشاہت آسمانوں پر تکوینی طور پر پوری ہو رہی ہے لیکن جہاں انسان کو اختیار دیا گیا

وہاں یہ معاملہ پورا نہیں ہو رہا۔ لہٰذا وہاں کے لیے فرمایا گیا کہ انذار کیجیے اور اللہ کی کبریائی کو قائم اور نافذ کیجیے۔ آج یہاں جو خود کو خدا سمجھ کر بیٹھے ہوئے ہیں' کوئی فرعون ہے' کوئی نمرود ہے' کوئی شداد ہے' کہیں پارلیمنٹ ہے' کہیں عدلیہ ہے اور کہیں اسٹیبلشمنٹ' ان کی ذمہ داری ہے کہ اللہ کی کبریائی قائم اور نافذ کرنے کی جِدّ و جُہد کریں۔ نبی کریم ﷺ نے اپنی ۲۳ سالہ جِدّ و جُہد کے نتیجے میں اللہ کی کبریائی کو قائم اور نافذ کر کے دکھا دیا۔

سورۃ المدثّر ہی میں ایک اور مقام پر فرمایا: ﴿کَلَّا وَ الۡقَمَرِ ﴿ۙ۳۲﴾ وَ الَّیۡلِ اِذۡ اَدۡبَرَ ﴿ۙ۳۳﴾﴾ ''ہرگز نہیں! قسم ہے چاند کی' اور قسم ہے رات کی جب کہ وہ پیٹھ موڑے۔'' یہاں رات کے آخری پہر کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ رات اب رخصت ہوا چاہتی ہے۔ ﴿وَ الصُّبۡحِ اِذَاۤ اَسۡفَرَ ﴿ۙ۳۴﴾﴾ ''اور قسم ہے صبح کی جب وہ روشن ہو جائے۔''

بانی تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد ؒ نے ان آیات کے حوالے سے یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ یہ جو قسمیں کھائی جا رہی ہیں' یعنی رات کی قسم' درحقیقت یہ حضرت عیسیٰ ؑ کے بعد نبی آخر الزماں ﷺ تک جو ۶۰۰ سال کا وقفہ تھا اُس تاریکی کی طرف اشارہ ہے جس میں وحی کا سلسلہ منقطع رہا اور آسمانی ہدایت کی روشنی بہت مدّھم پڑ چکی تھی۔ جیسے چاند کی روشنی کا تقابل اگر سورج کے ساتھ کریں تو وہ بہت مدّھم سی ہوتی ہے۔ یہی معاملہ ہے کہ وہ ایک طویل اندھیری رات تھی اور اگرچہ اس میں کہیں کہیں چاند کی مدّھم سی روشنی موجود تھی' لیکن اب وہ بھی جا رہی تھی اور ختم ہو رہی تھی۔ اس کے بعد فرمایا کہ قسم ہے صبح کی جب وہ روشن ہو جائے' یعنی یہ امر بالکل واضح ہو جائے کہ رات ختم ہو گئی ہے۔ سورج طلوع ہوتا ہے تو ہر چیز روشن ہو جاتی ہے۔ یہ نبی کریم ﷺ کی بعثت کے لیے استعارہ ہے۔ جو جہالت اور ضلالت دنیا پر چھائی ہوئی تھی' جیسے تاریک رات مسلّط تھی' اب محمدِ عربی ﷺ کی رسالت سے وہ روشن اور منور ہونے کو ہے۔ وہ ہدایت اپنی تکمیلی شان کو پہنچ گئی جس کے حوالے سے فرمایا گیا: ''آج کے دن مَیں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور مَیں نے اپنی نعمت کا تم پر اِتمام کر دیا اور تمہارے لیے اسلام کو بحیثیتِ دین پسند فرمایا۔'' اس آیت میں اُمّتِ مُسلمہ کے لیے بہت بڑا سرٹیفکیٹ ہے' جسے ذاتِ باری تعالیٰ نے جاری فرمایا ہے۔ یہ وہ آیت ہے جس کے بارے میں یہود کہا کرتے تھے کہ اگر ہمارے لیے نازل ہوئی ہوتی تو اس کے نزول والے دن کو ہم بطورِ عید مناتے۔ نوعِ انسانی کی تاریخ میں نبی کریم ﷺ کی بعثت' نبوتِ محمدی ؐ کا ظہور بہت بڑا واقعہ ہے۔

اس کے بعد سورۃ الانشقاق کی آیات میں کچھ اور قسمیں بھی کھائی گئی ہیں۔ فرمایا: ﴿فَلَاۤ اُقۡسِمُ بِالشَّفَقِ ﴿ۙ۱۶﴾ وَ الَّیۡلِ وَ مَا وَسَقَ ﴿ۙ۱۷﴾ وَ الۡقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ﴿ۙ۱۸﴾﴾ ''پس نہیں' مجھے قسم ہے

شام کی سرخی کی‘ اور رات کی اور اُن چیزوں کی جن کو وہ سمیٹے ہوئے ہے‘ اور چاند کی جب وہ پورا ہو جاتا ہے۔‘‘ سورۃ المدثّر کی آیات میں نبی اکرم ﷺ کی بعثت کی خوش خبری دی گئی تھی۔ اب اسلام کی روشنی چار دانگِ عالم میں پھیل گئی‘ لیکن پھر آہستہ آہستہ زوال آنا شروع ہوتا ہے۔ اس کی وجہ بھی بڑے واضح انداز میں اقبال نے بتادی تھی ؎

مَیں تجھ کو بتاتا ہوں‘ تقدیرِ اُمم کیا ہے!
شمشیر و سناں اوّل‘ طاؤس و رباب آخر

جب طاؤس ورباب مقدم ہو گئے تو زوال آ گیا۔ اُس وقت نام کے تو خلیفۃ المسلمین تھے لیکن ان کے رنگ ڈھنگ قیصر و کسریٰ کی طرح ہو گئے تھے۔ وہی بڑے بڑے محلات بنائے جا رہے تھے‘ سونے چاندی کے برتنوں کا استعمال ہوتا تھا‘ حرم آباد ہو رہے تھے۔ ایسے میں اللہ کے عذاب کا کوڑا تاتاریوں کی صورت میں برسا۔ آہستہ آہستہ زوال بڑھتا گیا۔

اِسی کو نبی کریم ﷺ نے ایک حدیث میں پانچ ادوار کی صورت میں بیان فرمایا ہے۔ پہلا دورِ نبوت علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا‘ دوسرا دورِ خلافت راشدہ کا‘ اس کے بعد کاٹ کھانے والی ملوکیت‘ کہ تھے تو مسلمانوں کے خلیفہ لیکن انداز ملوکیت والے تھے۔ اگرچہ خلافت راشدہ والا نظام تو نہیں تھا لیکن بہرحال مسلمانوں کی حکومت تو تھی۔ پھر اگلا دور مطلق جبریت والا آ گیا۔ پورے عالمِ اسلام میں استعمار نے اپنے پنجے گاڑ دیے۔ کہیں انگریز‘ کہیں ولندیزی‘ کہیں اطالوی اور کہیں جرمن آ گئے۔ آخر کار پھر خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا دور آئے گا اور اسی کی طرف یہاں پر بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ قسم ہے چاند کی جب وہ پورا ہو جائے گا۔ اب وہ معاملہ نہیں ہوگا جیسے رسالتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا آفتاب طلوع ہوا تھا۔ اب چاند کی طرح یہ نشاۃِ ثانیہ کا معاملہ ہے۔ دوبارہ جو عروج حاصل ہوگا‘ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھے گا۔ پہلے ہزار سال میں تمام مجددین عالمِ عرب میں آئے۔ عمر بن عبد العزیز‘ امام ابوحنیفہ‘ امام مالک‘ امام شافعی‘ امام احمد بن حنبل‘ امام غزالی‘ امام ابن تیمیہ رحمہم اللہ سب عالمِ عرب میں تھے‘ لیکن چار سو سال سے اللہ تعالیٰ نے اس خطے یعنی برصغیر پاک و ہند کو پسند فرمایا ہے۔ چنانچہ دوسرے ہزار سالہ دور میں برصغیر میں مجدد الف ثانی‘ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمہم اللہ جیسی انتہائی جامع شخصیات پیدا ہوئیں۔ سیّد احمد شہید جیسی شخصیت جن کے جہاد و قتال نے دورِ صحابہ کا عکس پیش کر دیا۔ شیخ الہند‘ محمود حسن اسیر مالٹا‘ علامہ اقبالؒ جیسا مفکر‘ ابوالکلام آزاد جیسا عبقری‘ مولانا مودودی جیسا مصنف‘ مولانا الیاس جیسا مبلغ پوری دنیا میں کہیں نہیں (رحمۃ اللہ علیہم اجمعین)۔ پھر داعیٔ قرآن‘ بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ نے اس احیائی عمل کو آگے بڑھایا۔

یہ احیائی عمل اس طرح سے جاری رہے گا جو بالآخر خلافت علیٰ منہاج النبوۃ پر منتج ہوگا۔ ایک اور حدیث میں ارشاد فرمایا: ’’میرے لیے زمین کو سکیڑ دیا گیا پس مَیں نے اس کے مشارق و مغارب کو دیکھ لیا‘ اور میری اُمّت کا اقتدار وہاں تک پہنچے گا جہاں تک مجھے سمیٹ کر دکھا دیا گیا۔‘‘

اس خطے میں پاکستان کا قیام بھی اسی تجدیدی مساعی کا حصہ ہے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن جیسا مسلم دشمن شخص یہاں وائسرائے تھا۔ اسی طرح ہندو اپنے راج کی سوچ رکھتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اندرا گاندھی نے مشرقی پاکستان کے علیحدہ ہونے پر کہا تھا کہ ہم نے اپنی ہزار سالہ غلامی کا بدلہ لے لیا ہے۔ ہندو تو اپنے راج کا سوچ کر بیٹھا ہوا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے معجزانہ طور پر ہمیں پاکستان عطا کیا۔ البتہ ہم نے دین سے دوری کی روش اختیار کی۔ جس مقصد کے لیے ہم نے پاکستان حاصل کیا تھا وہ پورا نہ ہو سکا۔ قراردادِ مقاصد منظور ہوئی تو یہاں پارلیمنٹ میں بیٹھے لوگوں نے کہا کہ آج ہمارے سر شرم سے جھک گئے ہیں‘ ع ’’کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں!‘‘ یہ عوامی حاکمیت کا دور ہے‘ یہ جمہوریت کا دور ہے لیکن اس میں بھی تم کہتے ہو کہ حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کی ہوگی اور قرآن وسُنّت کے خلاف کوئی قانون سازی نہیں کی جائے گی!

پھر اللہ تعالیٰ نے ہم پر ایک اور فضل و کرم کیا اور ہمیں ایٹمی صلاحیت عطا کی۔ بہرحال یہ صلاحیت بھی ہمیں معجزانہ طور پر ہی حاصل ہوئی۔ گویا یہ دو معجزے آپس میں مل گئے۔ پہلا پاکستان کا قیام جو ایک نظریاتی مملکت ہے۔ پوری دنیا میں نظریے کی بنیاد پر قائم کی گئی یہ واحد ریاست ہے۔ اسرائیل کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ نظریاتی ریاست ہے لیکن درحقیقت وہ نسلی بنیاد پر وجود میں آئی تھی کیونکہ یہودیت ایک نسلی مذہب ہے۔ مذہب کی بنیاد پر صرف یہ ایک ملک پاکستان ہے۔ یہاں اگر نظریہ نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کی حفاظت کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایٹمی صلاحیت عطا کی۔ درحقیقت یہ پوری اُمّتِ مُسلمہ کی امانت ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ جب ایٹمی دھماکے ہوئے تھے تو فلسطین اور عالمِ عرب میں مٹھائیاں بانٹی گئی تھیں۔ اُنہیں معلوم تھا کہ یہ پاکستان کی نہیں بلکہ پوری اُمّتِ مُسلمہ کی طاقت ہے۔ سازشیں تو پاکستان بننے کے ساتھ ہی شروع ہو گئی تھیں۔ چنانچہ بن گوریان نے ۱۹۶۷ء میں کہہ دیا تھا کہ عربوں سے ہمیں کوئی خطرہ نہیں ہے‘ ہمارا اصل نظریاتی دشمن پاکستان ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ پاکستان کے قیام کے نو مہینے بعد اسرائیل وجود میں آیا۔ اللہ تعالیٰ نے ہر بیماری کی دوا اس کے ظہور سے پہلے پیدا کی ہے۔ ناجائز صہیونی ریاست اسرائیل ایک بہت بڑی بیماری ہے‘ جس کی دوا اللہ تعالیٰ نے پاکستان کی صورت میں پہلے پیدا کر دی۔ اسی طرح ہماری ایٹمی صلاحیت بھی اسرائیل کے توڑ کے لیے ہے۔ (باقی صفحہ 82 پر)

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُوْرَۃُ الْفَجْرِ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

وَالۡفَجۡرِ ۙ﴿۱﴾ وَلَیَالٍ عَشۡرٍ ۙ﴿۲﴾ وَّالشَّفۡعِ وَالۡوَتۡرِ ۙ﴿۳﴾ وَالَّیۡلِ اِذَا یَسۡرِ ﴿ۚ۴﴾
ہَلۡ فِیۡ ذٰلِکَ قَسَمٌ لِّذِیۡ حِجۡرٍ ؕ﴿۵﴾ اَلَمۡ تَرَ کَیۡفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِعَادٍ ۪ۙ﴿۶﴾
اِرَمَ ذَاتِ الۡعِمَادِ ۪ۙ﴿۷﴾ الَّتِیۡ لَمۡ یُخۡلَقۡ مِثۡلُہَا فِی الۡبِلَادِ ۪ۙ﴿۸﴾ وَ ثَمُوۡدَ
الَّذِیۡنَ جَابُوا الصَّخۡرَ بِالۡوَادِ ۪ۙ﴿۹﴾ وَفِرۡعَوۡنَ ذِی الۡاَوۡتَادِ ۪ۙ﴿۱۰﴾ الَّذِیۡنَ
طَغَوۡا فِی الۡبِلَادِ ۪ۙ﴿۱۱﴾ فَاَکۡثَرُوۡا فِیۡہَا الۡفَسَادَ ۪ۙ﴿۱۲﴾ فَصَبَّ عَلَیۡہِمۡ رَبُّکَ
سَوۡطَ عَذَابٍ ۚۙ﴿۱۳﴾ اِنَّ رَبَّکَ لَبِالۡمِرۡصَادِ ؕ﴿۱۴﴾ فَاَمَّا الۡاِنۡسَانُ اِذَا مَا
ابۡتَلٰىہُ رَبُّہٗ فَاَکۡرَمَہٗ وَ نَعَّمَہٗ ۬ۙ فَیَقُوۡلُ رَبِّیۡۤ اَکۡرَمَنِ ؕ﴿۱۵﴾ وَ اَمَّاۤ
اِذَا مَا ابۡتَلٰىہُ فَقَدَرَ عَلَیۡہِ رِزۡقَہٗ ۬ۙ فَیَقُوۡلُ رَبِّیۡۤ اَہَانَنِ ﴿ۚ۱۶﴾ کَلَّا بَلۡ
لَّا تُکۡرِمُوۡنَ الۡیَتِیۡمَ ۙ﴿۱۷﴾ وَ لَا تَحٰٓضُّوۡنَ عَلٰی طَعَامِ الۡمِسۡکِیۡنِ ۙ﴿۱۸﴾ وَ
تَاۡکُلُوۡنَ التُّرَاثَ اَکۡلًا لَّمًّا ۙ﴿۱۹﴾ وَّتُحِبُّوۡنَ الۡمَالَ حُبًّا جَمًّا ؕ﴿۲۰﴾ کَلَّاۤ اِذَا
دُکَّتِ الۡاَرۡضُ دَکًّا دَکًّا ۙ﴿۲۱﴾ وَّ جَآءَ رَبُّکَ وَ الۡمَلَکُ صَفًّا صَفًّا ﴿ۚ۲۲﴾
وَجِایۡٓءَ یَوۡمَئِذٍۭ بِجَہَنَّمَ ۬ۙ یَوۡمَئِذٍ یَّتَذَکَّرُ الۡاِنۡسَانُ وَ اَنّٰی لَہُ
الذِّکۡرٰی ؕ﴿۲۳﴾ یَقُوۡلُ یٰلَیۡتَنِیۡ قَدَّمۡتُ لِحَیَاتِیۡ ﴿ۚ۲۴﴾ فَیَوۡمَئِذٍ لَّا یُعَذِّبُ
عَذَابَہٗۤ اَحَدٌ ۙ﴿۲۵﴾ وَّ لَا یُوۡثِقُ وَ ثَاقَہٗۤ اَحَدٌ ؕ﴿۲۶﴾ یٰۤاَیَّتُہَا النَّفۡسُ
الۡمُطۡمَئِنَّۃُ ﴿٭ۖ۲۷﴾ ارۡجِعِیۡۤ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرۡضِیَّۃً ﴿ۚ۲۸﴾ فَادۡخُلِیۡ فِیۡ
عِبٰدِیۡ ۙ﴿۲۹﴾ وَادۡخُلِیۡ جَنَّتِیۡ ﴿۳۰﴾

آیت ۱ ﴿وَالۡفَجۡرِ ۙ﴿۱﴾﴾ ’’قسم ہے فجر کی۔‘‘

سورۃ الفجر کی ابتدائی آیات قسموں کے حوالے سے مشکلات القرآن میں سے ہیں اور ان کے بارے میں متعدد اقوال ہیں۔ بہر حال اس پہلی آیت کے بارے میں عام رائے یہ ہے کہ اس سے ۱۰ ذی الحجہ کی فجر مراد ہے جس کے بعد قربانی ہوتی ہے اور یہ دن مناسکِ حج کے حوالے سے بنیادی اور خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔

آیت ۲ ﴿وَلَیَالٍ عَشۡرٍ ۙ﴿۲﴾﴾ ’’اور قسم ہے دس راتوں کی۔‘‘

پہلی قسم کی مناسبت سے اکثر مفسرین نے ان راتوں سے ۱۰ ذی الحجہ کی فجر سے پہلے کی دس راتیں مراد لی ہیں۔ ظاہر ہے ۱۰ ذی الحجہ کی فجر سے پہلے ۱۰ ذی الحجہ کی رات گزر چکی ہوتی ہے‘ اس لیے وہ رات بھی ان میں شامل ہے۔

آیت ۳ ﴿وَّالشَّفۡعِ وَالۡوَتۡرِ ۙ﴿۳﴾﴾ ’’اور قسم ہے جُفت کی اور طاق کی۔‘‘

اس سے عموماً رمضان کے آخری عشرہ کی جُفت اور طاق راتیں مراد لی جاتی ہیں اور طاق راتوں میں لیلۃ القدر ہے۔ البتہ دنیا کے تمام علاقوں میں چاند چونکہ ایک ساتھ نظر نہیں آتا اس لیے مختلف علاقوں کی طاق اور جُفت راتوں میں فرق ہوگا۔ مثلاً ہو سکتا ہے ہمارے ہاں پاکستان میں جو رات طاق ہو سعودی عرب میں وہ جُفت ہو۔

آیت ۴ ﴿وَالَّیۡلِ اِذَا یَسۡرِ ﴿ۚ۴﴾﴾ ’’اور قسم ہے رات کی جب وہ گزرنے لگے۔‘‘

آیت ۵ ﴿ہَلۡ فِیۡ ذٰلِکَ قَسَمٌ لِّذِیۡ حِجۡرٍ ؕ﴿۵﴾﴾ ’’کیا اس میں کوئی قسم (دلیل) ہے اُن لوگوں کے لیے جو عقل مند ہیں؟‘‘

یعنی ان تمام چیزوں کو اگلی آیات کے مضمون پر گواہ ٹھہرایا گیا ہے۔

آیت ۶ ﴿اَلَمۡ تَرَ کَیۡفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِعَادٍ ۪ۙ﴿۶﴾﴾ ’’کیا آپ نے دیکھا نہیں کیا کیا تھا آپ کے ربّ نے عاد کے ساتھ؟‘‘

آیت ۷ ﴿اِرَمَ ذَاتِ الۡعِمَادِ ۪ۙ﴿۷﴾﴾ ’’وہ ارم جو ستونوں والے تھے۔‘‘

’’اِرم‘‘ کے بارے میں عام مؤرخین کا خیال ہے کہ یہ قومِ عاد کے شاہی خاندان کا لقب تھا۔ یعنی جس طرح مصر میں فراعنہ‘ عراق میں نماردہ اور یمن میں تبابعہ خاندانوں کی حکومتیں تھیں‘ اسی طرح قومِ عاد کے علاقے میں ارم خاندان برسرِ اقتدار تھا۔ یہاں ان کے حوالے سے ستونوں

کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ وہ لوگ اپنی تعمیرات میں ستونوں کو خصوصی اہمیت دیتے تھے اور دنیا میں ستونوں پر بڑی بڑی عمارتیں کھڑی کرنے کا طریقہ سب سے پہلے انہوں نے ہی شروع کیا تھا۔ جیسے اس قوم کے ایک شہر کے جو زیر زمین آثار دریافت ہوئے ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ اس شہر کی فصیل پر تیس ستون یا مینار بنائے گئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شہر شدّاد نے خصوصی اہتمام کے ساتھ بسایا تھا جو اُس قوم کا بہت بڑا بادشاہ تھا۔

آیت ۸ ﴿الَّتِیۡ لَمۡ یُخۡلَقۡ مِثۡلُہَا فِی الۡبِلَادِ ۝۸﴾ ''جن کے مانند نہیں پیدا کیے گئے (دنیا کے) ملکوں میں۔''

یعنی قد و قامت اور جسمانی قوت کے لحاظ سے دنیا میں ان کا کوئی ثانی پیدا نہ ہوا۔ ان الفاظ کا ایک مفہوم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس قوم نے جس معیار اور جس انداز کی تعمیرات کی تھیں ایسی تعمیرات ان سے پہلے دنیا میں کسی اور قوم نے نہیں کی تھیں۔ شاید اسی لیے تاریخ میں شدّاد کی ''جنتِ ارضی'' مشہور ہے۔

آیت ۹ ﴿وَ ثَمُوۡدَ الَّذِیۡنَ جَابُوا الصَّخۡرَ بِالۡوَادِ ۝۹﴾ ''اور ثمود کے ساتھ (کیا کیا آپ کے رب نے) جنہوں نے وادی میں چٹانوں کو تراشا تھا۔''

قومِ ثمود کے لوگ پہاڑوں کو تراشنے کے ماہر تھے۔ وہ بڑے بڑے پہاڑوں کو تراش کر خوبصورت کشادہ گھر اور محلّات بناتے تھے۔ پہاڑوں سے تراشے ہوئے اُن کے گھر اور محلات آج بھی موجود ہیں۔

آیت ۱۰ ﴿وَ فِرۡعَوۡنَ ذِی الۡاَوۡتَادِ ۝۱۰﴾ ''اور فرعون کے ساتھ (کیا کیا) جو میخوں والا تھا۔''

اوتاد (وتد کی جمع) لوہے کی میخوں کو بھی کہتے ہیں اور لکڑی کے کھونٹوں کو بھی جن کے ساتھ خیموں کی رسیاں باندھی جاتی ہیں۔ چنانچہ ایک رائے تو یہ ہے کہ یہ اُس کے لشکروں کے خیموں کے کھونٹوں کا ذکر ہے۔ اس لیے کہ اس کے لشکر بہت بڑے تھے اور وہ بڑی شان و شوکت کا مالک تھا۔ جب وہ چڑھائی کرتا تو لشکروں کے خیمے نصب کرنے کے لیے کھونٹوں کا ایک بڑا ذخیرہ ان کے ہمراہ ہوتا۔ ایک دوسری رائے یہ بھی ہے کہ وہ جس سے ناراض ہوتا اسے صلیب پر چڑھا کر اس کے جسم میں میخیں لگوا دیتا تھا۔ (واللہ اعلم!)

آیت ۱۱ ﴿الَّذِیۡنَ طَغَوۡا فِی الۡبِلَادِ ۝۱۱﴾ ''جنہوں نے (اپنے اپنے) ملکوں میں سرکشی

اختیار کی تھی۔''

آیت ۱۲ ﴿فَاَکۡثَرُوۡا فِیۡہَا الۡفَسَادَ ۝۱۲﴾ ''سو انہوں نے ان میں بکثرت فساد پھیلا دیا تھا۔''

ظاہر ہے جب اللہ تعالیٰ کے احکام اور اس کے نظام سے سرکشی ہوگی تو اس کا نتیجہ مخلوقِ خدا پر ظلم و زیادتی کی صورت میں سامنے آئے گا اور اسی ظلم و زیادتی کا نام فساد ہے۔ جس طرح آج G-7 اور G-9 ممالک کی انسان دشمن پالیسیاں دنیا میں فساد کا باعث بن رہی ہیں۔ ان ظالمانہ پالیسیوں کے نتیجے میں سرمایہ داروں اور محروم طبقہ کے افراد کے درمیان North versus South کے عنوان سے خطرناک محاذ آرائی شروع ہو چکی ہے۔ لیکن اب وہ وقت بھی دور نہیں جب اس صورتِ حال کے خطرناک نتائج خود ان کے اپنے گلے کا طوق بنیں گے: ؎

اور بھی دورِ فلک ہیں ابھی آنے والے
ناز اتنا نہ کریں ہم کو ستانے والے!

بہرحال زمین میں فساد ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے احکام سے انسانوں کی سرکشی کی وجہ سے ہی پیدا ہوتا ہے' جیسا کہ سورۃ الروم کی اس آیت میں فرمایا گیا ہے: ﴿ظَہَرَ الۡفَسَادُ فِی الۡبَرِّ وَ الۡبَحۡرِ بِمَا کَسَبَتۡ اَیۡدِی النَّاسِ﴾ (آیت ۴۱) ''بحر و بر میں فساد رونما ہو چکا ہے' لوگوں کے اعمال کے سبب۔''

آیت ۱۳ ﴿فَصَبَّ عَلَیۡہِمۡ رَبُّکَ سَوۡطَ عَذَابٍ ۝۱۳﴾ ''تو دے مارا ان کے اوپر آپ کے رب نے عذاب کا کوڑا۔''

چنانچہ یہ سب قومیں اپنی سرکشی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے عذاب کا شکار بنیں اور دنیا سے ان کا نام و نشان مٹ گیا۔

آیت ۱۴ ﴿اِنَّ رَبَّکَ لَبِالۡمِرۡصَادِ ۝۱۴﴾ ''بے شک آپ کا رب تو (سرکشوں اور مفسدوں کی) تاک میں ہے۔''

یعنی کوئی فرد ہو یا کوئی قوم' جو کوئی بھی اللہ تعالیٰ سے سرکشی کرے گا اللہ تعالیٰ اسے اس جرم کی سزا ضرور دے گا۔

آیت ۱۵ ﴿فَاَمَّا الۡاِنۡسَانُ اِذَا مَا ابۡتَلٰىہُ رَبُّہٗ فَاَکۡرَمَہٗ وَ نَعَّمَہٗ﴾ ''انسان کا معاملہ

یہ ہے کہ جب اُس کا ربّ اُسے آزماتا ہے پھر اُسے عزّت دیتا ہے اور نعمتیں عطا کرتا ہے‘‘

﴿فَيَقُولُ رَبِّيٓ أَكۡرَمَنِ ١٥﴾ ’’تو وہ کہتا ہے میرے رب نے مجھے عزّت دی!‘‘

آیت ۱۶ ﴿وَأَمَّآ إِذَا مَا ٱبۡتَلَىٰهُ فَقَدَرَ عَلَيۡهِ رِزۡقَهُۥ﴾ ’’اور جب وہ اسے آزماتا ہے پھر اُس کا رزق اس پر تنگ کر دیتا ہے‘‘

﴿فَيَقُولُ رَبِّيٓ أَهَٰنَنِ ١٦﴾ ’’تو وہ کہتا ہے میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا!‘‘

آیت ۱۷ ﴿كَلَّاۖ﴾ ’’ایسا ہرگز نہیں ہے!‘‘

یہ مقام اپنے مضمون کے اعتبار سے پورے قرآن مجید میں منفرد و ممتاز ہے۔ مذکورہ دونوں کیفیات کے حوالے سے انسان کے جن مکالمات کا یہاں ذکر ہوا ہے بظاہر ان میں کوئی خرابی یا شرک کی آلودگی نظر نہیں آتی۔ دونوں کلمات توحید کے عین مطابق ہیں۔ رزق کی فراخی اور تنگی کے حوالے سے عزّت اور ذِلّت کو کسی دیوی یا دیوتا سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ سے منسوب کیا گیا ہے کہ میرے رب نے مجھے عزّت دی ہے اور یہ کہ میرے رب نے مجھے ذلیل کیا ہے۔ بظاہر تو یہ اللہ تعالیٰ کے فرمان ﴿وَتُعِزُّ مَنۡ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنۡ تَشَآءُ ؕ﴾ (آلِ عمران:۲۶) ہی کا اقرار ہے‘ کہ اے اللہ تُو جس کو چاہتا ہے عزّت دیتا ہے اور تُو جسے چاہتا ہے ذلیل کر دیتا ہے۔ تو پھر یہاں ان جملوں کو آخر قابلِ مذمت کیوں ٹھہرایا گیا ہے؟ اس نکتہ لطیف کو سمجھنے کے لیے اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ توحید تو ہدایت کی جڑ اور بنیاد ہے‘ جبکہ اس بنیاد سے اوپر بھی ہدایت کی بہت سی منازل ہیں۔ اس لیے ایک بندۂ مؤمن کو زندگی میں راہنمائی کے لیے اپنی نگاہیں صرف مینارۂ توحید پر ہی مرکوز نہیں رکھنی چاہئیں بلکہ اسے شاہراہِ ہدایت کے ہر سنگِ میل اور ہر موڑ کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے اندازِ فکر اور طرزِ عمل کا رخ متعین کرنا چاہیے۔

چنانچہ ان جملوں کے حوالے سے اصل اور بنیادی خرابی یہ ہے کہ یہاں انسانی سوچ نے رزق کی فراخی اور تنگی کو عزّت اور ذِلّت کا معیار سمجھ لیا ہے اور اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا ہے کہ انسان کے رزق کی بست وکشاد اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیشہ امتحان اور آزمائش کے لیے ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ انسان کو کبھی زیادہ رزق دے کر آزماتا ہے تو کبھی اس کو معاشی تنگی سے دوچار کر کے اس کا امتحان لیتا ہے۔ گویا انسان کے لیے عیش و آرام اور مال و دولت کی فراوانی میں بھی امتحان ہے اور رنج و عسرت اور تنگدستی و ناداری بھی امتحان ہی کے مراحل ہیں۔ اس زاویے سے دیکھا

جائے تو جس انسان نے مال و دولت کی کمی یا زیادتی کو ذِلّت اور عزّت کا معیار سمجھ لیا وہ دھوکا کھا گیا —— ایک بندۂ مؤمن کو تو دنیوی عزّت و ذِلّت کی ویسے بھی پروا نہیں ہونی چاہیے۔ ظاہر ہے اصل اور حقیقی عزّت یا ذِلّت کا فیصلہ تو قیامت کے دن ہوگا۔ چنانچہ جس انسان کو اللہ تعالیٰ رزق کی فراخی سے آزما رہا ہے اس کی عزت اس میں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرے اور اپنے دائیں بائیں محروم و نادار لوگوں کو ان کا وہ حق ادا کرے جو اللہ تعالیٰ نے آزمائش کی غرض سے اس کے مال میں رکھ دیا ہے۔ اسی طرح جس شخص کا امتحان رزق کی تنگی کے ساتھ ہو رہا ہے اس کی عزّت اس میں ہے کہ وہ صبر کرے اور اپنی عزّتِ نفس کو بچا کر رکھے۔

اس معاملے کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ اگر رزق کی کمی بیشی اور عزّت و ذِلّت کے حوالے سے مذکورہ فلسفہ واقعتاً ہماری سمجھ میں آ بھی جائے تو بھی ہمارا نفس ہمیں یہ پٹی ضرور پڑھاتا ہے کہ رزق کی فراخی والی آزمائش آسان ہے اور اس کے مقابلے میں غربت و تنگدستی کی آزمائش بہت مشکل ہے‘ جبکہ اصل حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اس حوالے سے اصل حقیقت یہ ہے کہ غربت و تنگدستی کی آزمائش سے سرخرو ہونا انسان کے لیے نسبتاً آسان ہے اور اس کے مقابلے میں مال و دولت کی فراوانی کی آزمائش میں ثابت قدم رہنا بہت مشکل ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ آسائش و آرام میں انسان کے غافل ہو جانے اور اللہ تعالیٰ کو بھول جانے کا زیادہ امکان ہے‘ جبکہ مشکل اور پریشانی کی کیفیت میں انسان ہر وقت اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا رہتا ہے۔ اس حوالے سے حضورﷺ کا فرمان ہے: ((مَا قَلَّ وَكَفٰى خَيْرٌ مِمَّا كَثُرَ وَاَلْهٰى))[1] ’’جو (مال) مقدار میں کم ہو مگر کفایت کر جائے وہ اس سے بہتر ہے جو زیادہ ہو مگر غافل کر دے۔‘‘

امام احمد بن حنبل ؒ جب خلیفۂ وقت کے عتاب کا شکار ہوئے تو جیل میں آپ پر بے پناہ تشدد کیا گیا۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ اس زمانے میں آپؒ کو جس تشدد کا سامنا کرنا پڑا ویسا تشدد اگر ہاتھی پر بھی کیا جاتا تو وہ بھی بلبلا اٹھتا۔ لیکن آپ نے وہ اذیت ناک آزمائش کمال صبر و استقامت سے برداشت کی اور اس دوران آنکھوں میں کبھی آنسو تک نہ آنے دیے۔ لیکن دوسرے خلیفہ کے دور میں جب آپؒ کو رہائی ملی اور آپؒ کی خدمت میں اشرفیوں کے توڑے بطور نذرانہ پیش کیے گئے تو آپؒ یہ ’’نذرانہ‘‘ دیکھ کر بے اختیار رو پڑے اور اللہ تعالیٰ کے حضور التجا کی کہ اے اللہ! تیری

۱۔ رواہ احمد والطبرانی فی الکبیر۔ راوی: ابو الدرداءؓ۔

یہ آزمائش بہت سخت ہے‘ مَیں اس آزمائش کے قابل نہیں ہوں۔

اس ساری گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ ’’توحید‘‘ ہدایت کا پہلا اور بنیادی درجہ ہے۔ اگر انسان اپنے اچھے بُرے ہرطرح کے حالات کو من جانب اللہ سمجھے تو اس کا یہ طرزِ عمل توحید کے عین مطابق ہے۔ لیکن اس کے اوپر بھی ہدایت کے بہت سے درجات ہیں۔ ان درجات میں سے ایک درجہ یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی آزمائش و ابتلاء کے اصول وضوابط کو سمجھے اور یقین رکھے کہ دنیا کے عیش وآرام اور تنگدستی وعسرت کی کیفیات اللہ تعالیٰ کی آزمائش ہی کی مختلف صورتیں ہیں اور یہ کہ تنگدستی و عسرت کی آزمائش کے مقابلے میں دولت کی فراوانی کی آزمائش کہیں زیادہ سخت اور خطرناک ہے۔

﴿بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ۝١٧﴾ ’’بلکہ تم لوگ یتیم کی عزّت نہیں کرتے۔‘‘

آیت ۱۸ ﴿وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝١٨﴾ ’’اور نہ ہی تم لوگ آپس میں مسکینوں کو کھلانے کی ترغیب دیتے ہو۔‘‘

کسی دوسرے شخص کو کسی نیکی کی ترغیب دینا اس لیے بھی مشکل ہے کہ اس کے لیے انسان کو پہلے خود اس نیکی پر کاربند ہونا پڑتا ہے۔ آیت زیر مطالعہ میں دراصل اسی انسانی کمزوری کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ نہ تم خود بھوکوں کو کھانا کھلاتے ہو اور نہ ہی دوسروں کو اس نیک کام کی ترغیب دیتے ہو۔

آیت ۱۹ ﴿وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ۝١٩﴾ ’’اور تم ساری کی ساری میراث سمیٹ کر کھا جاتے ہو۔‘‘

اس آیت میں انسانوں کے بنائے ہوئے غیر متوازن اور ظالمانہ قوانینِ وراثت کی طرف بھی اشارہ ہے اور اس سے یہ بھی مراد ہے کہ تم میں سے جو طاقتور ہے وہ مختلف حیلوں بہانوں سے تمام وراثت پر قبضہ کر لینا چاہتا ہے۔ واضح رہے کہ قرآن مجید نے دنیا کو مفصل‘ جامع اور متوازن قوانینِ وراثت عطا کیے ہیں۔ اسلام سے قبل عرب معاشرے میں باپ کی پوری وراثت بڑے بیٹے کو منتقل ہو جاتی تھی اور چھوٹے تمام بہن بھائیوں کو اس میں سے کچھ بھی نہیں ملتا تھا۔ دنیا کے بعض ممالک میں ایسے ظالمانہ قوانین آج بھی نافذ العمل ہیں۔

آیت ۲۰ ﴿وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۝٢٠﴾ ’’اور تم مال سے ٹوٹ کر محبت کرتے ہو۔‘‘

دنیوی مال و دولت کی محبت تمہارے دلوں میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ واضح رہے کہ سورتوں کے اس جوڑے یعنی سورۃ الفجر اور سورۃ البلد میں نزولِ قرآن سے قبل کے عرب

معاشرے کے تمدن اور رسم و رواج کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ مثلاً طاقتوروں کے میراث کو زبردستی ہڑپ کر جانے‘ مال و دولت کی غیر معمولی محبت اور اسی محبت کی وجہ سے خدمتِ خلق کے کاموں سے پہلوتہی کرنے کی مثالیں اس معاشرے میں عام تھیں۔

آیت ۲۱ ﴿كَلَّآ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا ۝٢١﴾ ’’ہرگز نہیں! جب زمین کو کوٹ کوٹ کر ہموار کر دیا جائے گا۔‘‘

اس آیت کا یہ ترجمہ شاہ ولی اللہ ؒ کے فرزند ارجمند شاہ عبدالقادر ؒ کے ترجمہ کے مطابق ہے‘ جبکہ ان کے بھائی شاہ رفیع الدین ؒ نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے کہ جب زمین کو ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا۔

آیت ۲۲ ﴿وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ۝٢٢﴾ ’’اور آپ کا رب جلوہ فرما ہو گا جب کہ فرشتے قطار در قطار حاضر ہوں گے۔‘‘

سورۃ الحاقہ میں قیامت کے دن کا ایک منظر اس طرح بیان کیا گیا ہے: ﴿وَّالْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآىِٕهَا ؕ وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَىِٕذٍ ثَمٰنِيَةٌ ۝١٧﴾ ’’اور فرشتے ہوں گے اس کے کناروں پر‘ اور اس دن آپ کے ربّ کے عرش کو اٹھائے ہوئے ہوں گے آٹھ فرشتے‘‘۔ سورۃ الرحمٰن میں اس دن کے آسمان کی کیفیت کا ذکر یوں آیا ہے: ﴿فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ۝٣٧﴾ ’’پھر جب آسمان پھٹ جائے گا اور ہو جائے گا گلابی‘ تیل کی تلچھٹ جیسا۔‘‘

قرآن مجید میں قیامت کے دن سے متعلق جو تفصیلات بیان ہوئی ہیں ان پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ میدانِ حشر اسی زمین پر قائم ہو گا۔ زمین کو کھینچ کر چپٹا ﴿وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ ۝٣﴾ (الانشقاق) اور کوٹ کوٹ کر ایسے ہموار کر دیا جائے گا کہ اس کے تمام نشیب وفراز ختم ہو جائیں گے ﴿لَا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا ۝١٠٧﴾ (طٰہٰ)۔ پہاڑوں کو روئی کے گالوں کی طرح اڑا دیا جائے گا۔ پھر زمین پر اللہ تعالیٰ کا نزولِ اجلال ہو گا۔ اللہ تعالیٰ کی ایک خاص تجلی کے ساتھ آٹھ فرشتے نازل ہوں گے۔ دوسرے فرشتے صفیں باندھے کھڑے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کی عدالت لگے گی‘ حساب کتاب ہو گا اور یوں قصۂ زمین برسرِ زمین ہی طے ہو گا۔ گویا جس زمین پر انسانون نے اپنے اچھے بُرے اعمال کا ارتکاب و اکتساب کیا ہے‘ اسی زمین پر ان کا حساب ہو گا۔

آیت ۲۳ ﴿وَجِایْٓءَ يَوْمَىِٕذٍۢ بِجَهَنَّمَ ۙ﴾ ’’اور لے آئی جائے گی اُس روز جہنّم بھی‘‘

جہنّم کا ظہور بھی شاید زمین کے اندر سے ہی ہوگا۔ یعنی جب زمین کو کھینچ کر چپٹا کیا جائے گا تو اس کے اندر کا کھولتا ہوا لاوا باہر نکل آئے گا‘ جو جہنّم کا سماں پیدا کر دے گا۔ (واللہ اعلم!)

﴿یَوۡمَئِذٍ یَّتَذَکَّرُ الۡاِنۡسَانُ وَ اَنّٰی لَہُ الذِّکۡرٰی ﴿۲۳﴾﴾ ’’اُس دن انسان کو سمجھ آئے گی‘ لیکن اب سمجھنے کا کیا فائدہ!‘‘

شاہ عبدالقادرؒ صاحب نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے کہ ’’اُس دن سوچے آدمی اور کہاں ملے اس کو سوچنا؟‘‘ یعنی اُس دن انسان کو بہت کچھ یاد آ جائے گا کہ وہ دنیا سے اپنے ساتھ کیا لے کر آیا تھا اور اسے نصیحت بھی حاصل ہو جائے گی۔ لیکن اُس وقت کی نصیحت سے اسے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ ظاہر ہے فائدہ تو تب ہوتا اگر اس نے دنیا میں نصیحت پکڑی ہوتی۔

آیت ۲۴ ﴿یَقُوۡلُ یٰلَیۡتَنِیۡ قَدَّمۡتُ لِحَیَاتِیۡ ﴿۲۴﴾﴾ ’’وہ کہے گا: اے کاش میں نے اپنی زندگی کے لیے کچھ آگے بھیجا ہوتا!‘‘

یہاں لفظ حَیَاتِیۡ (میری زندگی) خاص طور پر لائقِ توجہ ہے۔ یعنی اُس وقت انسان کو معلوم ہو جائے گا کہ میری اصل زندگی تو یہ ہے جو اَب شروع ہوئی ہے۔ میں خواہ مخواہ دنیا کی زندگی کو اصل زندگی سمجھتا رہا جو اس اصل زندگی کی تمہید تھی۔

دراصل انسانی زندگی عالمِ ارواح سے شروع ہوتی ہے اور دنیا سے ہوتی ہوئی ابدالآباد تک جاتی ہے۔ دنیا کے ماہ وسال اور شب وروز کی گنتی سے زندگی کے اس طویل سفر کا حساب ممکن نہیں۔ علامہ اقبال نے اس فلسفے کی ترجمانی یوں کی ہے: ؎

تُو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں‘ پیہم دواں‘ ہر دم جواں ہے زندگی!

چنانچہ انسان کو اس حقیقت کا ادراک ہونا چاہیے کہ اس کی دُنیوی زندگی اُس کی جاودانی زندگی کے تسلسل کا ایک چھوٹا سا حصّہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اُس کے امتحان کے لیے منتخب فرمایا ہے اور اس وقفۂ امتحان کے اختتام کی علامت کے طور پر اُس نے موت کو تخلیق فرمایا ہے‘ تاکہ ہر انسان کے اعمال کی جانچ کی جا سکے: ﴿الَّذِیۡ خَلَقَ الۡمَوۡتَ وَ الۡحَیٰوۃَ لِیَبۡلُوَکُمۡ اَیُّکُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا ؕ﴾ (الملک: ۲) ’’اُس نے موت اور زندگی کو اس لیے پیدا کیا ہے تاکہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون اچھے اعمال کرنے والا ہے۔‘‘

آیت ۲۵ ﴿فَیَوۡمَئِذٍ لَّا یُعَذِّبُ عَذَابَہٗۤ اَحَدٌ ﴿۲۵﴾﴾ ’’تو اُس دن اللہ جو عذاب دے گا ویسا عذاب کوئی نہیں دے سکتا۔‘‘

آیت ۲۶ ﴿وَّ لَا یُوۡثِقُ وَ ثَاقَہٗۤ اَحَدٌ ﴿۲۶﴾﴾ ’’اور اُس کا سا باندھنا کوئی اور نہیں باندھ سکتا۔‘‘

میدانِ حشر میں ایک طرف تو یہ نقشہ ہوگا اور دوسری طرف کچھ ایسے خوش قسمت لوگ بھی ہوں گے جن سے کہا جائے گا:

آیت ۲۷ ﴿یٰۤاَیَّتُہَا النَّفۡسُ الۡمُطۡمَئِنَّۃُ ﴿۲۷﴾﴾ ’’اے نفسِ مطمئنہ!‘‘

جو اس امتحانی زندگی میں مطمئن ہو کر یکسوئی کے ساتھ اپنے رب کی بندگی میں لگا رہا اور اس کے دین کے ساتھ چمٹا رہا۔

آیت ۲۸ ﴿ارۡجِعِیۡۤ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرۡضِیَّۃً ﴿۲۸﴾﴾ ’’اب لوٹ جاؤ اپنے رب کی طرف اس حال میں کہ تم اس سے راضی‘ وہ تم سے راضی۔‘‘

سورۃ البیّنہ کی آیت ۸ میں ایسے خوش قسمت لوگوں کی یہی کیفیت ﴿رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡہُمۡ وَ رَضُوۡا عَنۡہُ ؕ﴾ ’’اللہ اُن سے راضی اور وہ اللہ سے راضی!‘‘ کے الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔

آیت ۲۹ ﴿فَادۡخُلِیۡ فِیۡ عِبٰدِیۡ ﴿۲۹﴾﴾ ’’تو داخل ہو جاؤ میرے (نیک) بندوں میں۔‘‘

اللہ تعالیٰ کے ان نیک بندوں کی نشاندہی سورۃ النساء کی اس آیت میں کی گئی ہے:

﴿وَ مَنۡ یُّطِعِ اللّٰہَ وَ الرَّسُوۡلَ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰہُ عَلَیۡہِمۡ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَ الصِّدِّیۡقِیۡنَ وَ الشُّہَدَآءِ وَ الصّٰلِحِیۡنَ ۚ وَ حَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیۡقًا ﴿۶۹﴾﴾

’’اور جو کوئی اطاعت کرے گا اللہ کی اور رسولؐ کی تو یہ وہ لوگ ہوں گے جنہیں معیت حاصل ہوگی اُن کی جن پر اللہ کا انعام ہوا‘ یعنی انبیاءِ کرام‘ صِدّیقین‘ شہداء اور صالحین۔ اور کیا ہی اچھے ہیں یہ لوگ رفاقت کے لیے!‘‘

آیت ۳۰ ﴿وَ ادۡخُلِیۡ جَنَّتِیۡ ﴿۳۰﴾﴾ ’’اور داخل ہو جاؤ میری جنّت میں!‘‘

چنانچہ اس نفسِ مُطمئنّہ سے کہا جائے گا کہ آؤ! میرے ان انعام یافتہ بندوں کی صف میں شامل ہو جاؤ۔ ایسے خوش قسمت لوگوں کے مراتب کی بلندی کے تصوّر اور اپنی تہی دامنی کے احساس کے پیشِ نظر ہمارا ان کی معیت کے لیے دُعا مانگنا اگرچہ ’’چھوٹا منہ بڑی بات‘‘ کے زمرے میں آتا ہے مگر پھر بھی دل سے بے اختیار دُعا نکلتی ہے: اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجۡعَلۡنَا مِنۡھُمۡ ــــ آمین!

سُوْرَةُ الْبَلَدِ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

لَاۤ اُقۡسِمُ بِہٰذَا الۡبَلَدِ ۙ﴿۱﴾ وَ اَنۡتَ حِلٌّۢ بِہٰذَا الۡبَلَدِ ۙ﴿۲﴾ وَ وَالِدٍ وَّ مَا
وَلَدَ ۙ﴿۳﴾ لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡ کَبَدٍ ؕ﴿۴﴾ اَیَحۡسَبُ اَنۡ لَّنۡ یَّقۡدِرَ
عَلَیۡہِ اَحَدٌ ۘ﴿۵﴾ یَقُوۡلُ اَہۡلَکۡتُ مَالًا لُّبَدًا ؕ﴿۶﴾ اَیَحۡسَبُ اَنۡ لَّمۡ یَرَہٗۤ
اَحَدٌ ؕ﴿۷﴾ اَلَمۡ نَجۡعَلۡ لَّہٗ عَیۡنَیۡنِ ۙ﴿۸﴾ وَ لِسَانًا وَّ شَفَتَیۡنِ ۙ﴿۹﴾ وَ
ہَدَیۡنٰہُ النَّجۡدَیۡنِ ۚ﴿۱۰﴾ فَلَا اقۡتَحَمَ الۡعَقَبَۃَ ۫ۖ﴿۱۱﴾ وَ مَاۤ اَدۡرٰىکَ مَا
الۡعَقَبَۃُ ؕ﴿۱۲﴾ فَکُّ رَقَبَۃٍ ۙ﴿۱۳﴾ اَوۡ اِطۡعٰمٌ فِیۡ یَوۡمٍ ذِیۡ مَسۡغَبَۃٍ ۙ﴿۱۴﴾ یَّتِیۡمًا
ذَا مَقۡرَبَۃٍ ۙ﴿۱۵﴾ اَوۡ مِسۡکِیۡنًا ذَا مَتۡرَبَۃٍ ؕ﴿۱۶﴾ ثُمَّ کَانَ مِنَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا
وَ تَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ وَ تَوَاصَوۡا بِالۡمَرۡحَمَۃِ ؕ﴿۱۷﴾ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ
الۡمَیۡمَنَۃِ ؕ﴿۱۸﴾ وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِاٰیٰتِنَا ہُمۡ اَصۡحٰبُ الۡمَشۡـَٔمَۃِ ؕ﴿۱۹﴾
عَلَیۡہِمۡ نَارٌ مُّؤۡصَدَۃٌ ﴿۲۰﴾

آیت ۱ ﴿لَاۤ اُقۡسِمُ بِہٰذَا الۡبَلَدِ ۝۱﴾ ”نہیں! مَیں قسم کھاتا ہوں اس شہر کی۔“

اس آیت میں بھی لَآ اُقۡسِمُ کا مفہوم بالکل وہی ہے جو اس سے پہلے ہم سورۃ القیامہ کی پہلی اور دوسری آیات یا سورۃ الانشقاق کی آیت ۱۶ میں پڑھ چکے ہیں۔ یعنی ان آیات میں لَا نافیہ نہیں ہے بلکہ مخاطبین کے خیالاتِ باطلہ کے ابطال کے لیے ہے۔ چنانچہ سورۃ القیامہ کی پہلی آیت ﴿لَاۤ اُقۡسِمُ بِیَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ ۝۱﴾ کا اگر ہم انگریزی ترجمہ کریں تو ہم کہیں گے: Nay, I swear by the Day of Judgement! دراصل انگریزی میں Nay کے بعد کوما (،) آ جانے سے مفہوم بالکل واضح ہو جاتا ہے، لیکن عربی میں چونکہ ”کوما“ وغیرہ کا استعمال نہیں ہوتا اس لیے سننے یا پڑھنے والا لَآ اُقۡسِمُ کا مفہوم یوں بھی سمجھ سکتا ہے کہ ”مَیں قسم نہیں کھاتا“۔ بہرحال اس آیت کا مفہوم یہی ہے کہ جو کچھ تم لوگ کہہ رہے ہو وہ درست

نہیں، بلکہ مَیں اس شہر یعنی مکّہ مکرمہ کی قسم کھاتا ہوں کہ تمہارے خیالات و نظریات باطل ہیں۔ آگے چل کر واضح ہو جائے گا کہ یہاں مکّہ مکرمہ کی قسم کیوں کھائی جا رہی ہے۔

آیت ۲ ﴿وَ اَنۡتَ حِلٌّۢ بِہٰذَا الۡبَلَدِ ۝۲﴾ ”اور (اے نبی ﷺ!) آپ حلال کر لیے گئے ہیں اس شہر میں۔“

کچھ مترجمین نے اس آیت کا ترجمہ یوں بھی کیا ہے کہ ”آپ کے لیے حلال ہو جائے گا یہ شہر“۔ یعنی اگرچہ یہ بلد الحرام ہے، یہاں خون ریزی وغیرہ کی اجازت نہیں، لیکن ایک وقت آئے گا کہ آپ کو اس کی اجازت مل جائے گی، جیسے فتح مکّہ کے دن مکّہ مکرمہ حضور ﷺ کے لیے حلال کر دیا گیا اور اس دن لشکر کشی کے دوران مسلّح تصادم کے اِکّا دُکّا واقعات بھی ہوئے۔ البتہ میرے نزدیک آیت کا اصل مدعا اور مفہوم وہی ہے جو مَیں نے ترجمے میں اختیار کیا ہے کہ اے نبی (ﷺ) ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس بلد الحرام میں آپؐ کی عزت پر حملے ہو رہے ہیں، آپؐ کی عزتِ نفس کو مجروح کیا جا رہا ہے، آپؐ کو مسلسل ستایا جا رہا ہے۔ اس وادی غَیۡرِ ذِیۡ زَرۡعٍ کے ماحول میں جہاں معمول کی زندگی بھی سراپا مشقت ہے وہاں اہلِ شہر کی مخالفت نے آپؐ کے لیے زندگی کو مزید کٹھن اور مشکل بنا دیا ہے۔ چنانچہ دعوتِ حق کی جدّوجہد میں مسلسل سختیاں برداشت کرتے ہوئے آپؐ کی زندگی کے شب و روز کی اس وقت جو صورتِ حال اور کیفیت ہے، ہم اس کی قسم کھا رہے ہیں۔

آیت ۳ ﴿وَ وَالِدٍ وَّ مَا وَلَدَ ۝۳﴾ ”اور قسم ہے والد کی اور اولاد کی۔“

اس قسم میں اس مشقّت اور ذمہ داری کی طرف اشارہ ہے جو ایک والد کو اپنی اولاد کی پرورش اور تربیت وغیرہ کے حوالے سے برداشت کرنی پڑتی ہے۔ اب اگلی آیت میں اس حقیقت یعنی مقسم علیہ کا ذکر ہے جس پر یہ قسمیں کھائی جا رہی ہیں:

آیت ۴ ﴿لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡ کَبَدٍ ۝۴﴾ ”بے شک ہم نے انسان کو پیدا ہی محنت اور مشقت میں کیا ہے۔“

سورۃ الانشقاق میں یہی مضمون اس طرح بیان ہوا ہے: ﴿یٰۤاَیُّہَا الۡاِنۡسَانُ اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدۡحًا فَمُلٰقِیۡہِ ۝۶﴾ ”اے انسان! تو مشقت پر مشقت برداشت کرتے جا رہا ہے اپنے رب کی طرف، پھر تو اس سے ملنے والا ہے“۔ انسانی زندگی کے بارے میں یہ تلخ حقیقت کسی

سے ڈھکی چھپی نہیں کہ اس دنیا میں کوئی انسان جیسا ہے‘ جہاں ہے‘ غریب ہے‘ امیر ہے‘ صاحبِ اقتدار ہے‘ فقیر ہے‘ کلفت‘ مشقت‘ کوفت‘ پریشانی اس کا مقدر ہے۔ کوئی انسان جسمانی محنت کے ہاتھوں بے حال ہے تو کوئی ذہنی مشقت کی وجہ سے پریشان۔ کوئی جذباتی اذیت سے دوچار ہے تو کوئی نفسیاتی خلفشار کا شکار ہے۔ کوئی کوڑی کوڑی کا محتاج ہے تو کسی کے لیے دولت کے انبار وبالِ جان ہیں‘ کسی کے پاس سر چھپانے کو جگہ نہیں تو کوئی مخملی گدیلوں پر لیٹا نیند کو ترستا ہے۔ غرض مختلف انسانوں کی مشقت کی کیفیت‘ نوعیت اور شدت تو مختلف ہو سکتی ہے مگر مشقت اور پریشانی سے چھٹکارا جیتے جی کسی کو بھی نہیں ہے۔ بقول غالب ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں!

بظاہر تو یہ صورتِ حال بھی بہت گمبھیر محسوس ہوتی ہے‘ لیکن انسان کی اصل مشکل اس سے کہیں بڑی ہے اور وہ مشکل یہ ہے کہ اسے دُنیوی زندگی میں پیش آنے والی یہ تمام پریشانیاں اور سختیاں بھی سہنی ہیں اور اس کے بعد اپنے ربّ کے حضور پیش ہو کر اپنے ایک ایک عمل کا حساب بھی دینا ہے۔ سورۃ الانشقاق کی مذکورہ آیت میں اسی ’’ملاقات‘‘ کا ذکر ہے۔ ظاہر ہے انسان کی قسمت کا حتمی فیصلہ تو اسی ملاقات میں ہونا ہے۔ اس ساری صورتِ حال میں انسان کی اصل مشقت‘ اصل مشکل اور اصل ٹریجڈی کا اندازہ لگانا ہو تو ایک ایسے انسان کا تصوّر کریں جو زندگی بھر ’’دنیا‘‘ حاصل کرنے کے جنون میں کولہو کا بیل بن کر محنت ومشقت کی چکی میں پستا اور طرح طرح کی ذہنی و نفسیاتی اذیتوں کی آگ میں جلتا رہا۔ پھر مشقتوں پر مشقتیں برداشت کرتا اور تکلیفوں پر تکلیفیں جھیلتا یہ انسان جب اپنے رب کی عدالت میں پیش ہوا تو اس کا دامن مطلوبہ معیار و مقدار کی نیکیوں سے خالی تھا۔ چنانچہ اس عدالت سے اسے دائمی سزا کا حکم ہوا: ﴿وَّیَصْلٰی سَعِیْرًا ﴿۱۲﴾﴾ (الانشقاق) اور اس کے بعد اسے جہنّم میں جھونک دیا گیا ــــــ ہمیشہ ہمیش کے لیے! یہ ہے انسان کی اصل مشکل اور اصل ٹریجڈی جس کا تصور بھی روح فرسا ہے۔ چنانچہ ہر انسان کو سنجیدگی سے سوچنا چاہیے کہ:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے؟

آیت ۵ ﴿اَیَحْسَبُ اَنْ لَّنْ یَّقْدِرَ عَلَیْهِ اَحَدٌ ﴿۵﴾﴾ ’’کیا یہ سمجھتا ہے کہ اس کے اوپر کوئی قابو نہیں پا سکے گا؟‘‘

مشقت میں پڑے ہوئے انسان کا حال دیکھو۔ اس حالت میں بھی وہ غرور کرتا ہے۔ ابوجہل کو دیکھو کیسے اکڑا ہوا ہے ــــــ مقامِ غور ہے! چاروں طرف سے مصائب و مشکلات میں گھرے ہوئے انسان کا اپنے خالق اور مالک کے سامنے یہ حال ہے تو اگر اس کے لیے دنیا میں آسانیاں ہی آسانیاں ہوتیں تو پھر یہ اللہ تعالیٰ سے کیسی کیسی بغاوتیں کرتا اور مخلوقِ خدا پر کیا کیا ستم ڈھاتا!

آیت ۶ ﴿یَقُوْلُ اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا ﴿۶﴾﴾ ’’کہتا ہے میں نے تو ڈھیروں مال خرچ کر ڈالا۔‘‘

اس فقرے میں سردارانِ قریش کی ذہنیت کی جھلک نظر آتی ہے۔ یہ لوگ بھلائی اور نیکی کے کام اکثر و بیشتر جذبۂ مسابقت کے تحت کرتے تھے اور پھر اپنی نیکیوں کا خوب چرچا کرتے اور شیخیاں بگھارتے تھے۔ حتیٰ کہ ان میں سے اکثر لوگوں کے ایمان نہ لانے کا سبب بھی یہی جذبۂ مسابقت تھا۔ ظاہر ہے وہ لوگ حضور ﷺ کو اپنے خاندان کے مدِمقابل خاندان کا ایک فرد سمجھتے تھے اور اس حیثیت سے آپؐ کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا انہیں کسی قیمت پر گوارا نہیں تھا۔ اس حوالے سے ابوجہل کا اقراری بیان تو تاریخ کے ریکارڈ پر موجود ہے۔ اس سے جب پوچھا گیا کہ کیا تمہارے خیال میں محمد (ﷺ) جھوٹے ہیں؟ تو اُس نے جواب دیا کہ نہیں‘ انہوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ اس پر پوچھنے والے نے سوال کیا کہ پھر تم اُنؐ پر ایمان کیوں نہیں لے آتے؟ اس پر اُس نے جو جواب دیا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے خاندان کا بنوہاشم کے ساتھ پشتوں سے مقابلہ چلا آ رہا ہے۔ انہوں نے غرباء کو کھانے کھلائے تو ہم نے ان سے بڑھ کر کھانے کھلائے۔ اگر وہ حجّاج کی خدمت کرنے میں پیش پیش رہے تو اس میدان میں بھی ہم نے انہیں آگے نہیں نکلنے دیا۔ یوں اب تک ہم ان کے ساتھ کندھے سے کندھا ملائے چلے آ رہے ہیں۔ اب اگر ہم ان کی نبوت کو تسلیم کر لیں تو ہم ہمیشہ کے لیے ان کے غلام بن جائیں گے اور یہ صورتِ حال کم از کم مجھے کسی قیمت پر قابلِ قبول نہیں۔

آیت زیر مطالعہ میں سردارانِ قریش کے اسی طرزِ عمل کی تصویر دکھائی گئی ہے کہ اگر ان میں

سے کوئی شخص کبھی بھلائی کا کوئی کام سرانجام دے لیتا ہے تو جگہ جگہ اس کا تذکرہ کرتا اور شیخیاں بگھارتا پھرتا ہے کہ فلاں کام میں مَیں نے ڈھیروں مال کھپا ڈالا ہے۔

آیت ۷ ﴿اَیَحۡسَبُ اَنۡ لَّمۡ یَرَہٗۤ اَحَدٌ ﴿۷﴾﴾ ''کیا اس کا گمان ہے کہ اُسے کسی نے دیکھا نہیں؟''

کیا وہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جو ہر شخص کے ایک ایک عمل سے واقف ہے اس کی اس نیکی سے وہ بے خبر ہے۔ یعنی اگر تو اس نے وہ نیکی اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے کی تھی تو پھر وہ اس کا ڈھنڈھورا کیوں پیٹ رہا ہے؟

آیت ۸ ﴿اَلَمۡ نَجۡعَلۡ لَّہٗ عَیۡنَیۡنِ ﴿۸﴾﴾ ''کیا ہم نے اس کو دو آنکھیں نہیں دیں؟''

آیت ۹ ﴿وَ لِسَانًا وَّ شَفَتَیۡنِ ﴿۹﴾﴾ ''اور ایک زبان اور دو ہونٹ (نہیں دیے)؟''

آیت ۱۰ ﴿وَ ہَدَیۡنٰہُ النَّجۡدَیۡنِ ﴿۱۰﴾﴾ ''اور ہم نے اس کو راہ دکھلا دی دو گھاٹیوں کی۔''

عام مفسرین کے نزدیک دو گھاٹیوں سے مراد نیکی اور بدی کے دو راستے ہیں۔ البتہ ایک رائے یہ بھی ہے کہ اس سے ماں کی دو چھاتیاں مراد ہیں۔ نجد کے لغوی معنی اُبھری ہوئی چیز کے ہیں۔ بلند سطح پر جو راستہ ہو اس کو بھی نجد کہتے ہیں۔ چنانچہ ''النَّجۡدَیۡنِ'' کے معنی ''دو بلند (واضح) راستے'' بھی ہو سکتے ہیں اور ''دو اُبھار'' بھی۔ اور مجھے مؤخر الذکر رائے زیادہ پسند ہے۔ انسان کی زبان، اس کے دو ہونٹوں اور پھر ماں کی چھاتیوں کے ذکر کے حوالے سے دراصل یہاں انسان کی اس جبلی اور پیدائشی ہدایت کا ذکر مقصود ہے جس کے بارے میں ہم سورۃ الاعلیٰ کی آیت ﴿وَ الَّذِیۡ قَدَّرَ فَہَدٰی ﴿۳﴾﴾ میں پڑھ آئے ہیں۔ ظاہر ہے ایک بچہ اپنی پیدائش کے فوراً بعد نہ صرف ماں کے دودھ کی تلاش شروع کر دیتا ہے بلکہ جونہی اس کی رسائی ماں کی چھاتیوں تک ہوتی ہے تو وہ دودھ چوسنے بھی لگتا ہے۔ اس نومولود کو آخر اپنی غذا کی تلاش کا یہ شعور کس نے دیا ہے؟ اور اس مرحلے پر زبان اور ہونٹوں کے اس خاص استعمال کا طریقہ اسے کس نے سکھایا ہے؟ ظاہر ہے یہ شعور، یہ آگہی اور یہ ہدایت اس کی اس فطرت اور جبلت کا حصّہ ہے جو اسے اللہ تعالیٰ نے عطا کی ہے اور اس اعتبار سے بچے کا یہ عمل اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔

آیت ۱۱ ﴿فَلَا اقۡتَحَمَ الۡعَقَبَۃَ ﴿۱۱﴾﴾ ''لیکن وہ گھاٹی کو عبور نہ کر سکا۔''

آیت ۱۲ ﴿وَ مَاۤ اَدۡرٰىکَ مَا الۡعَقَبَۃُ ﴿۱۲﴾﴾ ''اور تمہیں کیا معلوم کہ وہ گھاٹی کون سی ہے؟''

آیت ۱۳ ﴿فَکُّ رَقَبَۃٍ ﴿۱۳﴾﴾ ''کسی گردن کا چھڑا دینا۔''

یعنی مال خرچ کر کے کسی غلام کو آزاد کرا دینا، یا کسی مقروض کا قرض ادا کر دینا۔

آیت ۱۴ ﴿اَوۡ اِطۡعٰمٌ فِیۡ یَوۡمٍ ذِیۡ مَسۡغَبَۃٍ ﴿۱۴﴾﴾ ''یا کھانا کھلا دینا بھوک کے دن میں۔''

یعنی کسی شخص کا قحط سالی کے دوران بھوکوں کو کھانا کھلانا۔ خصوصی طور پر ایسی صورتِ حال میں جب اُسے اپنی اور اپنے اہل وعیال کی ضرورت کا خیال بھی پریشان کیے دے رہا ہو۔

آیت ۱۵ ﴿یَّتِیۡمًا ذَا مَقۡرَبَۃٍ ﴿۱۵﴾﴾ ''اُس یتیم کو جو قرابت دار بھی ہے۔''

آیت ۱۶ ﴿اَوۡ مِسۡکِیۡنًا ذَا مَتۡرَبَۃٍ ﴿۱۶﴾﴾ ''یا اُس محتاج کو جو مٹّی میں رُل رہا ہے۔''

یہ وہ فلسفہ ہے جس پر سورۃ الحدید کے مطالعہ کے دوران تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے۔ یہ مشکل گھاٹی دراصل حُبِّ مال کی وہ چٹان ہے جو متعلقہ انسان کے لیے بھلائی کے راستے کو مسدود کیے کھڑی ہے۔ سورۃ الحدید کی آیت ۱۸ کی وضاحت کرتے ہوئے مَیں نے اسے گاڑی کی بریک سے تشبیہہ دی تھی۔ چنانچہ مذکورہ گھاٹی کو عبور کرنے یا گاڑی کی بریک کو کھولنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنے مال کو اللہ ربّ العزت کی رضا کے لیے محتاجوں اور ناداروں کی مدد کرنے اور بھلائی کے دوسروں کاموں پر دل کھول کر خرچ کرے۔ یعنی مال کی محبّت کی آلودگی کو دل سے صاف کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ اپنے پیارے مال کو اللہ تعالیٰ کی محبت پر قربان کر دیا جائے۔ یاد رکھیں! حُبِّ مال کی گندگی کو دل سے نکالے بغیر انسان کو ایمان کی حلاوت نصیب نہیں ہو سکتی۔ (اس مضمون کی مزید وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ الحدید' آیات ۱۷ تا ۲۰ کی تشریح۔)

آیت ۱۷ ﴿ثُمَّ کَانَ مِنَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا﴾ ''پھر وہ شامل ہو اُن لوگوں میں جو ایمان لائے''

یہاں پر لفظ ثُمَّ بہت اہم اور معنی خیز ہے۔ یعنی پہلے انسان اس مشکل گھاٹی کو عبور کرے، اپنے دل کی زمین میں انفاق فی سبیل اللہ کا ہل چلائے، اس کے ذریعے سے دل کی زمین سے حبِ مال کا جھاڑ جھنکاڑ صاف کرے، اور پھر (ثُمَّ) اس میں ایمان کا بیج ڈالے۔ اگر وہ اس ترتیب اور اس انداز سے محنت کرے گا تو تبھی ایمان کا پودا اُس کے دل کی زمین میں اپنی جڑیں پھیلائے گا اور برگ وبار لائے گا۔

﴿وَ تَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ وَ تَوَاصَوۡا بِالۡمَرۡحَمَۃِ ﴿۱۷﴾﴾ ''اور جنہوں نے باہم ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کی اور باہم ایک دوسرے کو ہمدردی کی نصیحت کی۔''

یہ مضمون سورۃ العصر میں بایں الفاظ آیا ہے: ﴿اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ ۙ۬ وَتَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ ۳﴾ ''سوائے اُن کے جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے عمل کیے' اور باہم ایک دوسرے کو حق کی تاکید کی اور باہم ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کی''۔ الفاظ اور مفہوم کے اعتبار سے ان دونوں آیات میں گہری مشابہت پائی جاتی ہے۔ البتہ دونوں جگہ مذکور اصطلاحات کی ترتیب مختلف ہے۔ سورۃ العصر کی اس آیت میں ایمان کے بعد عمل صالح کا بیان ہے جبکہ آیت زیر مطالعہ میں عمل صالح (غرباء و مساکین اور یتیموں کے حقوق کی ادائیگی) کے بعد ایمان کا ذکر ہے۔ سورۃ العصر میں تواصی بالحق کے بعد تواصی بالصبر کا تذکرہ ہے' جبکہ یہاں پر پہلے تواصی بالصبر اور بعد میں تواصی بالمرحمۃ کا ذکر آیا ہے۔ اس پہلو سے دونوں آیات کے تقابلی مطالعہ سے بہت سے حقائق و رموز کی نشاندہی ہوتی ہے۔

آیت ۱۸ ﴿اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ الۡمَیۡمَنَۃِ ۱۸﴾ ''یہ ہوں گے داہنے والے۔''

یعنی یہ وہ لوگ ہوں گے جن کے اعمال نامے اُن کے دائیں ہاتھوں میں دیے جائیں گے۔ لفظ یمن کے معنی برکت اور خوش بختی کے بھی ہیں۔ اس معنی میں آیت کا مفہوم یوں ہوگا کہ یہ وہ خوش قسمت لوگ ہوں گے جو رشد و ہدایت کے راستے پر چلتے ہوئے فوز و فلاح کی منازل تک پہنچ گئے۔

آیت ۱۹ ﴿وَالَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِاٰیٰتِنَا﴾ ''اور جنہوں نے انکار کیا ہماری آیات کا''
﴿ہُمۡ اَصۡحٰبُ الۡمَشۡـَٔمَۃِ ۱۹﴾ ''وہ ہوں گے بائیں والے۔''

یعنی اُن کے اعمال نامے اُن کے بائیں ہاتھوں میں پکڑائے جائیں گے۔ لغوی اعتبار سے جس طرح یمن کے معنی خوش بختی کے ہیں اسی طرح اَلۡمَشۡـَٔمَۃ کے مادے (ش ء م) میں بدبختی اور نحوست کے معنی پائے جاتے ہیں (شومئ قسمت کی ترکیب اردو میں بھی مستعمل ہے)۔ لہٰذا اس آیت کا دوسرا ترجمہ یہ ہوگا کہ ''یہ بدبختی والے لوگ ہوں گے''۔ قرآن مجید میں آخرت کی کامیابی یا ناکامی کے حوالے سے دائیں والے (اصحاب المیمنۃ یا اصحاب الیمین) اور بائیں والے (اصحاب المشئمۃ یا اصحاب الشمال) کا ذکر بہت تکرار کے ساتھ آیا ہے۔ البتہ سورۃ الواقعہ کی اس آیت میں نسلِ انسانی کے تین گروہوں کا تذکرہ بھی ہوا ہے: ﴿وَّ کُنۡتُمۡ اَزۡوَاجًا

ثَلٰثَۃً ۷﴾ کہ اس دن تم لوگ تین گروہوں میں تقسیم ہو جاؤ گے۔ ان میں سے دو گروہ تو یہی (دائیں اور بائیں والے) بتائے گئے ہیں' جبکہ تیسرے گروہ کا ذکر ان الفاظ میں ہوا ہے: ﴿وَالسّٰبِقُوۡنَ السّٰبِقُوۡنَ ۱۰ اُولٰٓئِکَ الۡمُقَرَّبُوۡنَ ۱۱﴾ (الواقعۃ) ''اور آگے نکل جانے والے تو ہیں ہی آگے نکل جانے والے۔ وہی تو بہت مقرّب ہوں گے''۔ گویا یہ تیسرا گروہ اہلِ جنّت میں سے بہت ہی خاص لوگوں یعنی مقربینِ بارگاہ پر مشتمل ہوگا۔ بہرحال آیت زیر مطالعہ میں ان بدقسمت لوگوں کا ذکر ہوا ہے جنہیں بائیں ہاتھ میں اعمال نامے پکڑا کر جہنّم میں جھونک دیا جائے گا۔

آیت ۲۰ ﴿عَلَیۡہِمۡ نَارٌ مُّؤۡصَدَۃٌ ۲۰﴾ ''ان پر آگ بند کر دی جائے گی۔''

تاکہ پریشر ککر کی طرح آگ کی ساری تپش اندر ہی رہے اور انہیں شدید ترین عذاب ملے۔ اللہ کی پناہ! اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں ایسے عذاب سے محفوظ رکھے اور اپنی رحمت اور شانِ غفاری کے طفیل اصحابِ جنّت میں شامل فرمائے۔ آمین یا ربّ العالمین! ❁❁❁

خاندانی استحکام کے اصول

خطبۂ نکاح کی روشنی میں

حافظ عاطف وحید☆

خطبۂ مسنونہ کے بعد!

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ   بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ①﴾ (النساء)

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۱۰۲﴾ (آل عمران)

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ۷۰ يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا ۷۱﴾ (الاحزاب)

وقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ :

((اَلنِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِيْ)) (سنن ابن ماجہ:۱۸۴۶)

((فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِيْ فَلَيْسَ مِنِّيْ))

(صحیح البخاری:۵۰۶۳‘صحیح مسلم:۱۴۰۱)

((اَعْلِنُوْا هٰذَا النِّكَاحَ وَاجْعَلُوْهُ فِي الْمَسَاجِدِ وَاضْرِبُوْا عَلَيْهِ بِالدُّفُوْفِ))

(سنن الترمذی:۱۰۸۹‘سنن ابن ماجہ:۱۸۹۵)

او کما قال عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَام

☆انچارج شعبہ تحقیق و ناظم اعلیٰ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

حضرات! آپ یہاں عقدِ نکاحِ مسنونہ کی تقریب میں شرکت کے لیے تشریف لائے ہیں۔ اس مسجد کی روایت ہے کہ ایسی تقاریب میں جانبین کے سامنے موقع کی مناسبت سے قرآن وحدیث سے ماخوذ کچھ بنیادی تعلیمات رکھی جاتی ہیں۔ ہمارے ہاں اکثر و بیشتر اس تعلیم کا دستور نہیں رہا۔ عموماً کسی ایک کونے میں بیٹھ کر منتخب قرآنی آیات کی تلاوت اور احادیث مبارکہ پڑھ کر ایجاب وقبول ہو جاتا ہے۔ خوشی کے اس موقع کی مناسبت سے ہمارے دین کی کیا تعلیمات ہیں‘ کیا آدابِ معاشرت ہیں‘ ان کا کوئی تذکرہ نہیں ہوتا۔ حالانکہ نکاح کا تعلق انسان کی پوری زندگی کے ساتھ ہے۔ اس کے ذریعے ایک نیا گھرانہ وجود میں آ رہا ہے۔ چنانچہ ضروری ہے کہ اس سلسلے میں بنیادی دینی تعلیمات کا فہم حاصل ہو۔ ویسے اگر میرے بس میں ہو تو میں یہ چاہوں گا کہ نکاح سے پہلے ایک شارٹ تربیتی کورس ہونا چاہیے جس میں شادی بیاہ کے حوالے سے دینی تعلیمات‘ اس کا فلسفہ‘ حقیقت‘ احکام اور تمام اہم معاملات کا احاطہ کیا جائے۔ اس کے بعد کسی کو اجازت ہو کہ وہ نکاح کے بندھن میں بندھے۔ چونکہ ہمارے ہاں یہ معاملہ اس طریقے سے نہیں ہوتا اس لیے لوگ نکاح کرنے میں تو چست ہیں‘ لیکن ان اہم معاملات کو سمجھنے اور جاننے میں بہت سستی برتتے ہیں۔ اس سے نقصان ہوتا ہے‘ اس لیے کہ جب دین کے احکامات معلوم نہیں ہوتے تو ہر کوئی اپنی تاویل اور تعبیر کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ اکثر و بیشتر یہی ہوتا ہے کہ آپس میں تنازعات شروع ہو جاتے ہیں۔ اس پہلو سے یہ بہت ضروری ہے کہ اس ضمن میں دین کی تعلیمات کا شعور حاصل کیا جائے۔

عیسائی دنیا میں تین مواقع کے لیے خاص طور سے کتابیں اور گائیڈز لکھی گئی ہیں‘ جسے Hatch, Match and Dispatch Sacraments کا عنوان دیا گیا ہے۔ ان الفاظ کے اندر ایک صوتی آہنگ اور معنوی ربط بھی ہے۔ Hatch سے مراد یہ ہے کہ جب کوئی بچہ پیدا ہو‘ خوشی کا ماحول ہو تو اسے منایا اور celebrate کیا جائے۔ Match وہ موقع ہے کہ جس کے لیے آج ہم یہاں موجود ہیں‘ یعنی شادی کا موقع۔ یہ بھی ایک خوشی کا موقع ہے۔ اس کی بھی کچھ رسوم‘ طریقے اور آداب ہیں۔ تیسرا موقع جسے Dispatch کہا جاتا ہے وہ اس دنیا سے انسان کے رخصت ہونے کا وقت ہے۔ اگرچہ وہ ایک غمی کا موقع ہوتا ہے‘ لیکن اس کی رسومات بھی قدرے خوش اسلوبی سے پوری کی جاتی ہیں۔ دنیا میں جتنی بھی ثقافتیں اور تہذیبیں ہیں‘ ان کے

اندر یہ رسومات موجود ہیں۔

اسلام ایک کامل دین ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے زندگی کے ہر شعبے سے متعلق تعلیمات عطا فرمائیں۔ کوئی ایسا شعبہ نہیں ہے جس کے بارے میں قرآن یا حدیث میں واضح تعلیمات نہ ہوں۔ اس اعتبار سے مسلمانوں کو تو خاص طور سے اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر فاروق ؓ اپنے عہدِ خلافت میں بازاروں کا بھی چکر لگاتے تھے‘ یہ دیکھنے کے لیے کہ کیا حالات ہیں‘ ماحول کیسا ہے۔ اگر کسی شخص کو دیکھا کہ وہ لین دین کے دینی اصولوں سے کچھ انحراف کر رہا ہے تو اس سے پوچھتے تھے: کیا تم نے بیع وشراء کے احکام سیکھے ہیں؟ اگر نہیں سیکھے تو یہاں سے اُٹھ جاؤ۔ اگر بیٹھے رہو گے تو کوئی نہ کوئی گڑبڑ کرو گے‘ ماحول خراب کرو گے۔ پہلے سیکھ کر آؤ‘ پھر بازار میں بیٹھنا اور بیع وشراء کا معاملہ کرنا۔ جب کہ نکاح کا معاہدہ تو پوری زندگی پر محیط ہے۔ یہ کوئی ایک وقتی عمل یا برتاؤ نہیں بلکہ پوری زندگی کے نباہ کا معاملہ ہے۔ کیا اس کے لیے جو تعلیمات رسول اللہ ﷺ نے عطا فرمائی ہیں‘ ہمارے معاشرے میں انہیں سیکھنے کا اہتمام ہوتا ہے؟ زوجین کے کیا حقوق ہیں‘ کیا فرائض ہیں؟ شادی بیاہ کو جو دینی تقدس اور مشروعیت دی گئی ہے‘ اس کا مقصد کیا ہے؟ اس کا اصل فلسفہ کیا ہے؟ فلسفہ کسی شے کی حقیقت کو کہتے ہیں۔ وہ جو علامہ اقبال نے کہا ہے کہ: ؎

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے‘ وہ نظر کیا!

رسول اللہ ﷺ سے ایک دعا منسوب ہے: ((اَللّٰھُمَّ اَرِنِیْ حَقِیْقَۃَ الْاَشْیَاءِ کَمَا ھِیَ))
’’اے اللہ! مجھے اشیاء کی حقیقت دکھا دے‘ جیسے کہ وہ فی الواقع ہیں۔‘‘

یہ وہ حقائق ہیں کہ یہاں آنے سے پہلے آپ حضرات توقع نہیں کر رہے ہوں گے‘ کہ اس طرح کی بھی باتیں سننے کو ملیں گی۔ اس لیے کہ یہ خوشی کی تقریب ہے اور خوشی کی تقریب میں پندونصائح کا کیا کام؟ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس موقع پر چند ایسی باتیں اختصار کے ساتھ ضرور عرض کر دینی چاہئیں جو ہمارے لیے راہنمائی کا باعث بن سکیں۔

نکاح کی مشروعیت کے اسباب اور حکمتیں

سب سے پہلی بات تو یہ سمجھنے کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شادی بیاہ کے بندھن کو کیوں مشروع

کیا ہے۔ قرآن مجید کی آیات شاہد ہیں کہ اس کی کئی حکمتیں ہیں۔ پہلی یہ کہ اللہ چاہتا ہے کہ شادی بیاہ کے بندھن ہی سے کوئی بچہ اس دنیا میں آئے۔ اس رشتے سے باہر (out of wedlock) اگر کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک بہت سنگین معاملہ ہے۔ نکاح کا یہ بندھن مرد اور عورت کے اس تعلق کو ایک تقدس عطا کرتا ہے۔ اس کے لیے لازم ہے کہ ساری زندگی نباہ کرنے کا عزم وارادہ ہو۔ چنانچہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اسے اپنی نشانیوں میں سے ایک نشانی بتایا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا﴾ (الروم:۲۱)

’’اور یہ اللہ کی نشانیوں میں سے (ایک نشانی) ہے کہ اس نے تمہاری اپنی نوع سے تمہارے لیے جوڑے پیدا کیے۔‘‘

جوڑے سے مراد صنفی اختلاف ہے یعنی مذکر اور مؤنث‘ البتہ نوع ایک ہی ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام ہی سے ان کا جوڑا بنایا۔

سورۃ النحل میں ارشاد ہوا:

﴿وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِیْنَ وَحَفَدَةً﴾ (آیت ۷۲)

’’اور اللہ نے تمہاری بیویوں سے تمہارے لیے بیٹے اور پوتے پیدا کیے۔‘‘

صرف بیٹے ہی نہیں‘ پوتے بھی پیدا کیے۔ اس لیے کہ جب بچے بڑے ہو جاتے ہیں تو پھر انسان کا دل بہلانے کے لیے پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں کھلونوں کی مانند ہوتے ہیں۔ یہ سب کچھ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ اس لیے مشروع کیا تاکہ آخری انسان بھی جو اس دنیا میں آئے وہ اسی جائز اور پاکیزہ رشتے کے ذریعے سے آئے!

دوسری بات یہ ہے کہ شادی بیاہ کو اس لیے مشروع قرار دیا گیا تاکہ لوگ اس سے سکون حاصل کریں: ﴿.....لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَیْهَا﴾ (الروم:۲۱) ’’تاکہ تم اس سے سکون حاصل کرو‘‘۔ یہ معاملہ قرآن مجید میں ایک سے زیادہ مقامات پر آیا ہے۔ سورۃ الروم کے علاوہ سورۃ الاعراف میں بھی فرمایا: ﴿وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِیَسْكُنَ اِلَیْهَا ۚ﴾ (آیت ۱۸۹) ’’اور اسی (نوع) میں سے اس کی بیوی بنائی تاکہ اس سے سکون حاصل کرے۔‘‘ سکون اس وقت حاصل ہوگا جب جانبین کے درمیان موافقت ہوگی‘ اور دونوں اپنے اپنے واجبات وفرائض کو ادا کرنے والے

ہوں گے اور اپنے حق سے زائد کا مطالبہ نہ کرتے ہوں گے۔ جب دونوں اپنی ذمہ داریاں اور فرائض پورے کرنے والے ہوں تب سکون حاصل ہوگا۔ ہمارے معاشرے میں اکثر و بیشتر یہ ہوتا ہے کہ ابھی ’’ہنی مون پیریڈ‘‘ بھی پورا نہیں ہوا ہوتا کہ کچھ باتوں کے اوپر تنازعات شروع ہوجاتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ انہیں سنبھال دے اور وہ دونوں خود بھی ایسا ہی چاہیں تو الگ بات ہے‘ ورنہ وقت کے ساتھ تنازعات شدید ہوتے جاتے ہیں۔ پھر سکون بے سکونی میں بدل جاتا ہے۔

خاندان کے ادارے کا تصوّر اس لیے دیا گیا تا کہ انسان کو سکون ہو‘ لیکن مشاہدہ ہے کہ حالت بسا اوقات یہ ہوجاتی ہے کہ گھر میدانِ کارزار بنا ہوتا ہے۔ کبھی سوچیے کہ اس کی کیا وجہ ہے؟ یا تو مرد اپنے حقوق سے زائد کی توقع کرتا ہے یا عورت اپنے حقوق سے زائد کی توقع کر رہی ہوتی ہے۔ جو حقوق اور فرائض اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے متعین کیے ہیں اُن پر وہ اکتفاء نہیں کر رہے ہوتے۔ جبکہ یہ وہ معاملات ہیں جن کے لیے دینی تعلیمات ہی کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ معاملے کی یہ اہمیت صرف نئے جوڑے کے لیے ہی نہیں بلکہ سب کے لیے ہے۔ ان کے لیے بھی جو کئی برس پہلے شادی کے اس بندھن سے بندھ چکے ہیں اور وہ بھی کہ جو ابھی پائپ لائن میں ہیں‘ یہ بات سب کو سمجھنی چاہیے۔ اسی لیے یہ بڑا اہم مسئلہ ہے کہ اس ضمن میں ہمیں بنیادی تعلیمات حاصل ہوں۔

عورتوں کے حقوق

رسول اللہ ﷺ نے جو دین ہمیں عطا کیا اس کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں حقوق اور فرائض کا نظام مقرر کر دیا گیا تا کہ ہر شخص اپنی حدود (limits) میں رہے۔ چنانچہ عورتوں کے حوالے سے فرمایا گیا:

﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ (البقرۃ:۲۲۸)

’’اور ان (عورتوں) کے بھی ایسے ہی حقوق ہیں جیسے ان کی ذمہ داریاں ہیں دستور (شریعت) کے مطابق۔‘‘

بظاہر یہ بہت سادہ سی بات ہے لیکن درحقیقت ایک بہت بڑی خبر دی گئی ہے۔ اسلام سے پہلے عورت کے کوئی حقوق نہیں تھے۔ جیسے دوسرا مال اور میراث ہوتی ہے‘ اسے بھی ویسے ہی محض ایک مال سمجھا جاتا تھا۔ مرد کو لبھانے والی ایک ہستی سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ یہ صرف

دورِ جاہلیت کی بات نہیں بلکہ عیسائیت کے اندر آج بھی عورت کا یہی تصور ہے۔ ان کے انسائیکلوپیڈیاز کے اندر بھی اس کی یہ حیثیت درج ہے۔ ان کے نزدیک عورت کوئی ایسی مخلوق نہیں جو جنت میں داخل ہو سکے۔ لفظ evil بھی Eve سے اخذ کیا گیا ہے کہ عورت تو گویا برائی کا سرچشمہ ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ایسا نہیں ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی اصل تعلیمات ایسی ہی تھیں‘ اصل میں ان کے ہاں تحریفات ہوئی ہیں۔ یہ بس دنیا کی ایک ریت چلی‘ جس کے نتیجے میں یہ تصوّرات وہاں پر بھی پیدا ہو گئے۔ جیوئش انسائیکلوپیڈیا کے اندر بھی اسی قسم کی باتیں لکھی ہیں کہ اللہ کے تقرب اور اس کی رضا کے معاملات سے عورت کا کوئی لینا دینا نہیں‘ یہ سب مَردوں کے کام ہیں۔ ایسے حالات میں قرآن حکیم نے جب یہ فرمایا کہ عورتوں کے بھی حقوق ہیں تو یہ خبر کسی دھماکے سے کم نہ تھی۔ اگرچہ مرد و عورت کے حقوق کی نوعیت قدرے مختلف ہے لیکن بہرحال یہ تسلیم کیا جانا چاہیے کہ عورتوں کے بھی حقوق ہیں۔ ان حقوق کو معیّن (establish) کرنے کے حوالے سے قرآن مجید میں جابجا اس کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

مرد کی قوامیت کا صحیح مفہوم

قرآن کا اعلان ہے کہ: ﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ﴾ (النساء:۳۴) ’’مرد قوام ہیں عورتوں پر۔‘‘ یہ اصول اُس نقطہ نظر سے یکسر مختلف ہے جو آج کے دور میں عوام میں پیدا ہو گیا ہے اور اسے زبردستی قابلِ قبول بنایا جا رہا ہے۔ ’’قوام‘‘ کا اصل مطلب سرپرست‘ منتظم اور نگران ہے۔ یعنی یہ کہ عورت کی سرپرستی‘ کفالت اور اس کی ضروریات پوری کرنا مرد کے ذمہ ہے۔ گویا یہ نہیں ہے کہ عورت اپنی کمائی خود لے کر آئے اور اپنا خرچہ خود پورا کرے۔ اللہ تعالیٰ نے عورت پر معاشی طور پر کوئی ذمہ داری رکھی ہی نہیں۔ چھوٹی بچی ہے تو باپ اس کا کفیل ہے۔ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا ہے تو چچا یا بھائی کفیل ہیں۔ جب شادی کر دی گئی تو اب اس کا کھانا‘ پینا‘ کپڑا‘ رہائش سب شوہر کی ذمہ داری ہے۔ اگر شوہر نہیں رہا تو بیٹے ذمہ دار ہیں۔ عورت کو تو کبھی نہیں کہا گیا کہ تم نے کمانا ہے۔ اس قسم کے معاشی بوجھ سے اللہ تعالیٰ نے اس کو آزاد کر دیا۔ چنانچہ ﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ﴾ کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ مرد عورتوں پر حاکم ہیں‘ بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ مرد ذمہ دار ہے۔ یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے جو اللہ تعالیٰ نے مَردوں پر ڈال دی۔ مرد کی اس ذمہ داری کو بیلنس کرنے کے لیے ضروری تھا کہ خاندان کو ایک

ادارہ بنا دیا جائے۔ اور یہ ایک امرِ واقعہ ہے کہ کسی بھی ادارے کے اندر برابر کے حقوق رکھنے والے دو سربراہ نہیں ہو سکتے۔ اس ضمن میں اللہ تعالیٰ نے مرد کو سربراہ بنایا' اس لیے کہ وہ خلقی اور وہبی اعتبار سے (by default) بھی اس ذمہ داری کا زیادہ اہل ہے ﴿بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ ''بسبب اُس فضیلت کے جو اللہ نے بعض کو بعض پر دی ہے''، اور کسب و اکتساب کے حوالے سے بھی اس منصب کے قابل ہے ﴿وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ۭ﴾ ''اور بسبب اس کے کہ جو وہ اپنے مال خرچ کرتے ہیں''۔ مرد اپنا مال خرچ کرتا ہے۔ مہر مرد دیتا ہے' نفقہ مرد ادا کرتا ہے۔ دنیاوی امور کے لیے بھاگ دوڑ کرنا' محنت کرنا' کمانا' یہ ساری ذمہ داریاں مرد کی ہیں' اس لیے مرد کو اللہ تعالیٰ نے قوام بنا دیا تو اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ اہل و عیال کے ضمن میں مرد کی ذمہ داری ہے کہ تعلیم و تربیت کا وہ اہتمام کرے ﴿قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا ......﴾ (التحریم:۶) نان نفقہ و سکنیٰ کا بندو بست کرے ((وَلَهُنَّ عَلَيْكُمْ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ)) وغیرہ وغیرہ۔

بہترین لوگ کون؟

اس ضمن میں تیسری بات رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کی روشنی میں سمجھ لیجیے۔ آپؐ نے فرمایا: ((خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِاَهْلِهٖ)) ''تم میں بہترین لوگ وہ ہیں جو اپنے اہل و عیال کے حق میں بہتر ہیں۔'' ان سے حسنِ سلوک کرنے والے ہیں۔ یہ نہیں کہ مرد گھر میں آئے تو ایسے محسوس ہو جیسے کرفیو لگ گیا ہو۔ ہر طرف سناٹا چھا جائے کہ میرا بڑا رعب اور دبدبہ ہے۔ ہمارے معاشرے میں ایسا کلچر موجود ہے' جس کا رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے دین سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ ہمارے ہندوانہ بیک گراؤنڈ کی وجہ سے ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے تو اپنے آپ کو بطور مثال پیش فرمایا: ((وَاَنَا خَيْرُكُمْ لِاَهْلِيْ)) (سنن الترمذی:۳۸۹۵) ''اور مَیں اپنے اہل و عیال کے حق میں تم میں سب سے بہتر ہوں۔'' اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارا گھرانہ امن و آشتی کا مرکز بنے تو ذرا میرا اُسوہ اور نمونہ دیکھ لو۔ آج جب ہم اپنے گردوپیش کا جائزہ لیتے ہیں تو سچی بات یہ ہے کہ اپنے آپ سے شرم آنے لگتی ہے۔ ہمارا طریقہ کیا ہے اور رسول اللہ ﷺ کا اُسوہ کیا ہے! رسول اللہ ﷺ کی ایک نہیں' دو نہیں بلکہ بیک وقت نو تک بیویاں تھیں۔ یہاں تو کسی کی دو ہوں تو اُس کے لیے زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ آپ ﷺ بیک وقت نو ازواج

کے شوہر تھے لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ کا طرزِ عمل یہ تھا کہ اپنا کام خود کرتے تھے اور اپنی ازواج کے کاموں میں ان کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ ہم تو اُٹھ کے پانی پینے کے بھی روادار نہیں ہیں۔ ایسے شخص کو آج زن مرید کہا جاتا ہے۔ سوچ سمجھ کے بات کہنی چاہیے کہ اس کی زد کہاں جا کر پڑتی ہے۔ کبھی ایسی نوبت نہیں آئی کہ کسی زوجہ کو آپؐ سے کوئی تکلیف پہنچی ہو۔ اگر کوئی ناخوشگوار معاملہ ہوا بھی ہے تو آپ ﷺ نے خود اپنے اوپر جھیل لیا' ازواج کو ڈانٹ ڈپٹ کرنا یا زدوکوب کرنا آپؐ کا طریقہ نہیں ہے۔ یہ ہے رسول اللہ ﷺ کا اُسوہ۔

غلاموں اور عورتوں کے حقوق کا تاکیدی حکم

رسول اللہ ﷺ نے اپنے خطبہ حجۃ الوداع میں ایسی باتیں فرمائی ہیں کہ جو سنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ اس خطبہ کے بعد نہ کوئی آیت نازل ہوئی ہے نہ آپ ﷺ کا کوئی اور فرمان' لہٰذا ایک اعتبار سے یہ آپؐ کا حتمی اور فیصلہ کن بیان تھا۔ اس میں آپ ﷺ نے دو طبقات کا خاص طور پر ذکر کیا' اس لیے کہ اُس معاشرے میں وہ پسے ہوئے طبقات تھے۔ ایک غلاموں کا طبقہ اور ایک عورتوں کا۔ ان دونوں سے معاملات رکھنے کے بارے میں بڑے سخت الفاظ ہیں۔ غلاموں کے بارے میں فرمایا:

((اِخْوَانُكُمْ جَعَلَهُمُ اللّٰهُ تَحْتَ اَيْدِيكُمْ، فَمَنْ جَعَلَ اللّٰهُ اَخَاهُ تَحْتَ يَدِهٖ فَلْيُطْعِمْهُ مِمَّا يَاْكُلُ وَيُلْبِسْهُ مِمَّا يَلْبَسُ، وَلَا يُكَلِّفُهُ مِنَ الْعَمَلِ مَا يَغْلِبُهُ، اِنْ كَلَّفَهُ مَا يَغْلِبُهُ فَلْيُعِنْهُ عَلَيْهِ)) (صحیح البخاری:۲۳۷۱)

''یہ تمہارے بھائی ہیں۔ (ان سب کے جدِ امجد بھی حضرت آدم علیہ السلام ہی ہیں۔ یہ تم سے مختلف نہیں ہیں۔ ان کو پیدا کرنے والا بھی اللہ ہی ہے۔) اللہ نے انہیں تمہارا دست نگر بنا دیا ہے۔ اگر اللہ نے کسی کے بھائی کو اس کا دست نگر بنا دیا ہے (اگر کوئی بھائی اس حیثیت میں تمہارے ساتھ وابستہ ہو گیا ہے) تو اب تمہارا ذمہ یہ ہے کہ اسے وہی کچھ کھلاؤ جو خود کھاتے ہو' وہی کچھ پہناؤ جو خود پہنتے ہو۔ اور اس پر کوئی ایسا بوجھ مت ڈالنا جس کے تلے وہ دب کے رہ جائے۔ اگر کوئی کام محنت طلب ہے تو اس میں اس کی مدد کرو۔''

عورتوں کے ضمن میں تو حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے ایک سے زیادہ مواقع پر ہدایات دیں۔ کہیں فرمایا: ((اِسْتَوْصُوْا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا)) (متفق علیہ) ''عورتوں

کے ضمن میں میرا انتہائی تاکیدی حکم قبول کرو۔“ کہیں فرمایا: ((اِتَّقُوا اللّٰهَ فِی النِّسَاءِ)) (صحیح مسلم: ۱۲۱۸) ”عورتوں کے معاملات میں اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔“ یہ بھی فرمایا: ((فَاِنَّهُنَّ عَوَانٌ عِنْدَکُمْ)) ”وہ تمہارے پاس ایسے ہوتی ہیں گویا قیدی ہوں“۔ ایک گھر وہ تھا جہاں بچپن گزارا ہے‘ لڑکپن گزارا ہے۔ وہاں تو شہزادیاں تھیں‘ کیونکہ باپ کا گھر تھا۔ اب جس گھر میں آئی ہیں تو یہاں اجنبی ہیں۔ یہاں سب نئے لوگ ہیں‘ ایک نیا ماحول ہے۔ پھر فرمایا: ((اَخَذْتُمُوْهُنَّ بِاَمَانَةِ اللّٰهِ وَاسْتَحْلَلْتُمْ فُرُوْجَهُنَّ بِكَلِمَةِ اللّٰهِ)) ”تم نے انہیں اللہ تعالیٰ کی امانت کے طور پر حاصل کیا ہے اور ان سے مقاربت اللہ تعالیٰ کے کلمہ (ایجاب و قبول) کے ذریعے اپنے اوپر حلال کی ہے۔“ حقوق اور فرائض کے ضمن میں فرمایا: ((وَلَهُنَّ عَلَيْكُمْ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ)) (صحیح مسلم: ۱۲۱۸) ”تمہارے ذمے ہے ان کا کھانا پینا اور پوشاک (کپڑا‘ نفقہ اور ان کی رہائش) معروف اور دستور کے مطابق۔“

عورت کی بنیادی ذمہ داری

﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ ......﴾ (النساء: ۳۴) اسی آیت مبارکہ میں آگے نیک عورتوں کی خصوصیات کے ضمن میں فرمایا: ﴿فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ط﴾ ”پس جو نیک بیویاں ہیں وہ اطاعت شعار ہوتی ہیں‘ غیب میں حفاظت کرنے والیاں اللہ کی حفاظت سے“۔ گویا اللہ نے یہ پیمانہ دے دیا کہ نیک عورتیں وہ ہیں جو فرماں بردار ہیں۔ صرف اللہ کی فرماں بردار نہیں بلکہ اپنے شوہر کی بھی تابعِ فرمان! چنانچہ خاندان کے ادارے میں آخری فیصلہ مرد ہی کا ہوگا جسے خواہی نہ خواہی ماننا پڑے گا۔ عورت اسے چیلنج نہیں کرسکتی۔ اسی طرح سے وہ مرد کے نام و ناموس‘ عزت و آبرو اور اس کے مال کی حفاظت کرنے والیاں ہیں۔ یہ نہ ہو کہ رہنا تو کسی کے گھر میں ہے‘ منکوحہ کسی کی ہے لیکن تاریں کہیں اور جُڑی ہوئی ہیں اور ہدایات کہیں سے لی جارہی ہیں۔ چونکہ آج کل ہر کسی کی جیب میں gadgets آگئے ہیں‘ لہٰذا شیطان اپنا کام دکھاتا ہے۔ شوہر تو سارا دن گھر میں نہیں ہوتا۔ اس نے کام پر چلے جانا ہوتا ہے‘ پھر عورت ہی اس گھر کی مالکہ ہے۔ لہٰذا اب اسی کی ذمہ داری ہے کہ مذکورہ بالا معاملات کی حفاظت کرے۔

خطبہ حجۃ الوداع میں عورتوں کی سب سے اہم اور بنیادی ذمہ داری کے بارے میں رسول

اللہ ﷺ نے فرمایا: ((وَلَكُمْ عَلَيْهِنَّ اَلَّا يُوْطِئْنَ فُرُشَكُمْ اَحَدًا تَكْرَهُوْنَهُ)) ”اور ان پر تمہارا حق یہ ہے کہ وہ تمہاری خواب گاہوں میں (تمہارے گھروں میں) کسی ایسے شخص کو آنے کی اجازت نہ دیں جو تمہیں ناپسند ہو“۔ یعنی شادی کے بعد اب کوئی بے وفائی قبول نہیں ہوگی۔ جس کی منکوحہ ہے‘ اب تمام وفاداریاں اسی کے لیے ہیں۔ اگر اس معاملے میں کوئی خطا کرے تو اسے سمجھاؤ۔ اس کی خواب گاہ علیحدہ کردو‘ بستر علیحدہ کردو۔ اگر وہ پھر بھی نہیں مان رہی تو اس کا مطلب ہے کہ وہ مرد کی اتھارٹی کو چیلنج کر رہی ہے۔ لہٰذا ایسی صورت میں تادیباً انہیں مارنے کی بھی اجازت ہے۔ چنانچہ فرمایا: ((فَاِنْ فَعَلْنَ ذٰلِكَ فَاضْرِبُوْهُنَّ ضَرْبًا غَيْرَ مُبَرِّحٍ)) (صحیح مسلم: ۱۲۱۸) ”پھر اگر وہ ایسا کریں تو انہیں ایسی مار مارو جو زیادہ تکلیف دہ نہ ہو۔“ خیال رہے کہ ایسا صرف انتہائی صورت حال میں ہوگا۔ روزمرہ امور میں — کہ یہ کیوں ہوگیا اور فلاں چیز یہاں کیوں پڑی نظر آگئی‘ یا پھر کھانا نہیں صحیح بنا! ان پر اس کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ یہ معاملات عورت کی بنیادی ذمہ داری میں نہیں آتے‘ لہٰذا ان پر اس قسم کی سرزنش نہیں کی جائے گی۔ اگر اس اقدام کی اجازت ہے تو صرف بے وفائی کے معاملے میں۔ درست ہے کہ ہمارے ہاں جو عرف اور جو رسم و رواج ہیں‘ دین انہیں بھی ایک حد تک تسلیم کرتا ہے۔ عورت گھر کا کام کاج کرتی ہے تو یہ اس کی مہربانی ہے‘ اس لیے کہ مرد بھی اپنی بساط سے بڑھ کر اپنا سب کچھ اس کے لیے نچھاور کیے دیتا ہے۔ لہٰذا: ﴿هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ﴿۶۰﴾﴾ (الرحمٰن) ”احسان اور بھلائی کا بدلہ تو احسان ہی ہے۔“ بہرحال اصل اور بنیادی ذمہ داری رسول اللہ ﷺ نے انتہائی جامعیت کے ساتھ خطبہ حجۃ الوداع میں بیان کردی۔

خطبۂ نکاح کا لُبِّ لُباب: تقویٰ اور خدا خوفی

ابھی جو خطبہ نکاح آپ نے سماعت کیا ہے‘ اس کا ترجمہ اور سادہ مفہوم بھی سن لیجیے۔ یہ مسنون خطبہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ جب بھی کسی کا نکاح پڑھاتے تھے تو سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا ہوتی۔ اس لیے کہ اللہ ہی نے ہمیں پیدا کیا ہے‘ وہی ہمارا رازق ہے‘ مالک ہے‘ سزاوارِ حمد و ثنا ہے۔ اس کے بعد آپ ﷺ کلمہ شہادت ادا فرماتے: اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ —— گویا ایمان کی تجدید ہوگئی۔

اس کے بعد آپ کے سامنے سورۃ النساء‘ سورۂ آلِ عمران اور سورۃ الاحزاب کی چار آیات تلاوت کی گئی ہیں‘ جو اس موقع کے لیے نبی اکرم ﷺ کا انتخاب ہے۔ ان آیات میں اصل فوکس (focus) اور زور (emphasis) تقویٰ اور خدا خوفی پر ہے۔ اس لیے کہ اس دنیا اور آخرت میں کامیابی اور فلاح کا ضامن اللہ کا خوف ہی ہے۔ جس بندھن میں آج ایک جوڑا بندھنے جا رہا ہے‘ اس کی بھی کامیابی‘ بلکہ خوشی کی ضمانت تقویٰ اور خدا خوفی میں ہے‘ کسی اور شے میں نہیں۔ مال و دولت ثانوی چیزیں ہیں۔ اہل و عیال کی طرف سے خوشی کا اظہار اور دھوم دھڑکا ثانوی کیا ثالثی چیزیں ہیں۔ اصل شے خدا خوفی ہے۔

سورۃ النساء کی پہلی آیت: خطبہ نکاح میں نبی اکرم ﷺ سب سے پہلے سورۃ النساء کی پہلی آیت تلاوت فرماتے تھے:

﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوۡا رَبَّکُمُ الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّخَلَقَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا﴾

’’اے لوگو! اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو جس نے تمہیں ایک جان (یعنی حضرت آدمؑ) سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا۔‘‘

حدیث میں اس کی وضاحت آتی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام ہی سے اللہ تعالیٰ نے حضرت حواؑ کو پیدا کیا۔ سورۃ الحجرات میں بھی فرمایا: ﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقۡنٰکُمۡ مِّنۡ ذَکَرٍ وَّاُنۡثٰی﴾ (آیت ۱۳) ’’اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مذکر اور ایک مؤنث سے پیدا کیا ہے۔‘‘ یہ اللہ کی تخلیق ہے۔ تم سب ایک نوع سے ہو لیکن صنفیں مختلف ہیں۔ کوئی مذکر ہے‘ کوئی مؤنث۔ البتہ آج کل اس صنفی امتیاز کو ختم کرنے کی تحریکیں چل رہی ہیں۔ آزادیٔ نسواں (Women Lib) کی تحریک‘ وومن ایمپاورمنٹ کی تحریک تاکہ خواتین کو خودمختار بنایا جائے۔ اسی طریقے سے Women Emancipation کی تحریک ہے۔

اس سب کے لیے جو tool استعمال کیا جا رہا ہے وہ یہ کہ مرد اور عورت میں کوئی امتیاز نہیں ہے‘ دونوں بالکل برابر ہیں۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر تیسری جنس جسے ہم مخنث کہتے ہیں‘ اس کے نام سے یا اس کی اوٹ میں وہ تحریک چلائی جا رہی ہے جو شیطانی اور دجالی تحریک ہے۔ ’’ایل جی بی ٹی‘‘ کا قانون پاکستان سمیت دنیا بھر میں پاس ہو رہا ہے۔ ایک عام آدمی کو اس

کے نتائج کی پروا نہیں ہے لیکن درحقیقت پورا معاشرہ اس کی لپیٹ میں آ رہا ہے۔ قانون میں اسے سب سے اونچی جگہ دی جا رہی ہے۔ اگر ایل جی بی ٹی کا قانون پاس ہو چکا ہے تو اس کے خلاف کوئی کام کرنے سے overwhelming effect اسی قانون کا ہوگا۔ روایات‘ دین اور مذہب یہ سب ثانوی چیزیں ہو گئی ہیں۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ بے حیائی اور بے غیرتی کی راہ ہموار کر دی گئی۔ اللہ تعالیٰ نے تو مذکر اور مؤنث پیدا کیے‘ اگرچہ بعض لوگوں میں deformity ہوتی ہے لیکن دین میں اس کے احکام بھی دیے گئے ہیں۔ یہ باتیں کہیں مبہم نہیں چھوڑی گئیں۔ بہرحال شیطانی ایجنڈا اپنی جگہ موجود ہے۔ آگے فرمایا:

﴿وَبَثَّ مِنۡهُمَا رِجَالًا کَثِیۡرًا وَّنِسَآءً ۚ﴾

’’اور ان دونوں سے (یعنی آدم اور حوا سے) اللہ نے کثیر تعداد میں انسانوں کو (پیدا کر کے زمین میں) پھیلا دیا۔‘‘

تمام انسان ایک اللہ کے پیدا کردہ اور ایک جوڑے کی اولاد ہیں۔ چنانچہ ان میں نہ کوئی اونچا ہے نہ نیچا۔ کسی کو نسبی اعتبار سے اللہ تعالیٰ نے اونچا اور نیچا نہیں بنایا‘ اس لیے کہ سب ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں۔ ایک گھر میں تمام بھائی آپس میں برابر ہوتے ہیں۔ اسی طریقے سے ایک سطح وہ آتی ہے جہاں حضرت آدم علیہ السلام پر جا کر تمام انسان برابر ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ کہ سب کا خالق اور مالک ایک ہی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ کچھ لوگوں کا خالق کوئی اعلیٰ سطح کا الٰہ ہے اور کچھ کا کم سطح کا۔ جب خالق بھی ایک ہے‘ جدامجد بھی ایک ہے تو شریعت میں اونچ نیچ کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اللہ کے ہاں اگر کسی کا کوئی مقام اور مرتبہ ہے تو وہ محض تقویٰ کی بنیاد پر ہے۔ چنانچہ سورۃ الحجرات میں فرمایا: ﴿اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَ اللّٰهِ اَتۡقٰکُمۡ ؕ﴾ (آیت ۱۳) یعنی تم میں جو زیادہ متقی ہے وہ اللہ کے ہاں زیادہ معتبر ہے‘ اس کا احترام زیادہ ہے۔ یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ جب ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہو تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ تمہارے درمیان ایسی مہر و محبت ہونی چاہیے جیسے کہ ایک خاندان کے افراد میں ہوتی ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیۡ تَسَآءَلُوۡنَ بِهٖ﴾

’’اور اُس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جس کے نام پر تم ایک دوسرے سے مانگتے ہو۔‘‘

کوئی مدد مانگنی ہوتی ہے تو اللہ کے نام پر‘ حق مانگنا ہوتا ہے تو بھی اللہ کے نام پر۔ جھگڑے

ہو جاتے ہیں تو بھی آخر میں کہتے ہیں کہ بھائی اللہ کا نام لو‘ خدا کے واسطے معاملے کو طول نہ دو۔ بتایا جا رہا ہے کہ جس اللہ کے نام پر یہ سب کچھ کرتے ہوئے اگر اُس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو گے‘ اُس کے احکام پر عمل کرو گے تو مسائل بھی پیدا نہیں ہوں گے اور تمہاری زندگی بھی ایک خوش گوار زندگی ہوگی۔ اگر تم اُس کے احکام پر چلو گے تو ایسی زندگی ایک طرح سے عبادت متصور ہوگی۔

﴿وَالْاَرْحَامَ ؕ﴾ ’’اور (دیکھو!) رحمی رشتوں کا بھی (تقویٰ اختیار کرو)۔‘‘

اگرچہ حضرت آدم علیہ السلام پر تو تمام انسان برابر ہیں لیکن اس کے نیچے ’’اَلْاَقْرَبُ فَالْاَقْرَبُ‘‘ کی بنیاد پر قریبی رشتے وجود میں آتے ہیں۔ کچھ لوگ ہیں کہ جو ایک ماں باپ کی اولاد ہیں‘ ان کا حق دوسروں سے فائق ہے۔ ان کے حقوق کی پاس داری‘ ان کی ذمہ داری زیادہ بڑی ہے بہ نسبت دوسروں کے‘ جو ذرا زیادہ دُور کے ہیں۔ اب اس نکاح سے بعض نئے ’’رحمی رشتے‘‘ وجود میں آ رہے ہیں جن کے اپنے حقوق ہیں۔ ایک انسان کا اپنا خاندان ہوتا ہے اور ایک اس کی بیوی کا خاندان‘ یعنی سسرال۔ یہ سب کے سب گویا اب رحمی رشتے سے بندھ گئے ہیں۔ چنانچہ ان کے حقوق فائق ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ ان کی وجہ سے تم اللہ کے کٹہرے میں کھڑے ہو جاؤ۔ چنانچہ آیت کے آخر میں فرمایا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ①﴾ ’’یقیناً اللہ تم پر نگران (نگہبان) ہے۔‘‘

تم اللہ سے چھپ نہیں سکتے۔ تمہارے تمام شب و روز اُس کی نگاہ میں ہیں۔

سورۂ آلِ عمران‘ آیت ۱۰۲: خطبہ نکاح کی دوسری آیت سورۂ آل عمران کی آیت ۱۰۲ ہے۔ فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ﴾

’’اے ایمان والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جیسا کہ (جتنا کہ) اُس کے تقویٰ کا حق ہے۔‘‘

یہ تاکید کی انتہا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اللہ ہی ہمارا خالق‘ مالک‘ روزی رساں ہے۔ اس نے ہمیں وہ احکام دیے ہیں جو ہمارے ہی بھلے کے لیے ہیں۔ یوں کرو گے تو تمہارا بھلا ہوگا اور یوں نہیں کرو گے تو تمہارا نقصان ہوگا۔ پھر اللہ ہی وہ ہستی ہے جس کے حضور ہمیں مرنے کے بعد پیش ہونا ہے۔ جب آغاز بھی اللہ‘ اختتام بھی اللہ‘ درمیان میں بھی ہر معاملے میں اللہ ہی اللہ‘ تو پھر اصل سزاوارِ تقویٰ بھی اللہ ہی ہے! ذرا سوچیے‘ انسان عام طور سے اسی حد تک مکلف ہوتا ہے جتنی اس

کے اندر استطاعت ہوتی ہے۔ یہاں وہ اسلوب نہیں ہے بلکہ رسپانسبلٹی اس کی استطاعت سے بھی بڑھ کر مانگی جا رہی ہے کہ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جتنا کہ اُس کے تقویٰ کا حق ہے! اس کی بھی وجہ اور حکمت وہی ہے جو سطور بالا میں بیان کی گئی۔ ہم کہتے ہیں: اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ’’یقیناً ہم اللہ ہی کے ہیں اور اُسی کی طرف لوٹ جانے والے ہیں‘‘۔ لہٰذا ’’حَقَّ تُقٰتِهٖ‘‘ بہت سخت اسلوب ہے۔ پھر اس کی انتہا (extent) بھی بتائی جا رہی ہے۔ فرمایا:

﴿وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۱۰۲﴾

’’اور (دیکھو) تمہیں موت نہ آنے پائے مگر فرماں برداری کی حالت میں۔‘‘

گویا انسان کو ہر آن‘ ہر لمحے اپنے ہر ہر قول‘ ہر ہر عمل کو دیکھنا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھ سے کوئی غلط عمل سرزد ہو جائے‘ زبان سے کوئی غلط بات نکل جائے اور مَیں اللہ کی پکڑ میں آ جاؤں۔ اگر کبھی ایسا ہو جائے‘ اس لیے کہ انسان سے بھول چوک بھی ہو جاتی ہے‘ جذباتیت میں غلط کام بھی ہو جاتے ہیں‘ تو فوراً توبہ کرو‘ استغفار کرو‘ اللہ معاف فرما دے گا۔ تقویٰ کا یہ معیار صرف جمعہ کے دن یا رمضان میں نہیں بلکہ موت تک چاہیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ساری زندگی تو انسان دکھاوے کے لیے کچھ کرتا رہا لیکن عین موت کے وقت اس سے کوئی معصیت سرزد ہو جائے۔ لہٰذا محتاط طرزِ عمل کے ساتھ زندگی بسر کرنی چاہیے کہ آخری سانس پر ایمان کی موت کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہوں۔

سورۃ الاحزاب‘ آیات ۷۰ و ۷۱: پھر دو آیتیں سورۃ الاحزاب کی ہیں جو رسول اللہ ﷺ اس موقع پر تلاوت کر کے تذکیر فرماتے تھے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ۷۰﴾

’’اے ایمان والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو (خدا خوفی اختیار کرو) اور بات کرو تو سدید بات کرو۔‘‘

زبان کا تقویٰ اور اس کے غلط استعمال کی ممانعت

جیسے رحمی رشتوں کا تقویٰ بتایا گیا تھا‘ اب ایک اور شے کے تقویٰ کا ذکر ہے۔ یہ زبان کا تقویٰ ہے۔ زبان سے وہی بات کرو کہ جو ’’سدید‘‘ ہو‘ صحیح ہو۔ حیوانِ ناطق کو انسان بنانے والی شے گویائی ہی ہے‘ البتہ یہی اس کے لیے سب سے بڑا وبال بن جاتی ہے اگر اس کا غلط استعمال

ہو۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ انسان کو جہنم میں لے جانے والی سب سے بڑی شے زبان کی کھیتیاں ہیں ((حَصَائِدُ الْأَلْسِنَةِ))۔ یہی وجہ بن جائے گی کسی شخص کو جہنم میں دھکیلے جانے کی کہ اُس کی زبان قابو میں نہیں تھی' زبان دراز تھا۔ شادی بیاہ اور گھر گرہستی کے معاملے میں سب سے زیادہ تباہ کن شے یہی ہوتی ہے۔ ذرا ایسی بات کہہ دی جو کہنے کا حق نہیں تھا تو ایسے دل پر لگتی ہے کہ پھر اس کا زخم مندمل نہیں ہو سکتا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم مجھے زبان کی ضمانت دے دو' میں تمہیں جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔

''قُوْلُوْا قَوْلًا سَدِیْدًا'' بہت بامعنی اور جامع الفاظ ہیں۔ یہ بھی کہا جا سکتا تھا کہ: قُوْلُوْا قَوْلًا صِدْقًا ''سچی بات کرو'' یا پھر قُوْلُوْا قَوْلًا حَقًّا ''حق بات کرو''، لیکن لفظ ''سَدِید'' فرمایا۔ اس کی وضاحت کے لیے سورۃ الحجرات کی آیت ۱۱ ملاحظہ کیجیے: ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ .....﴾ ''اے اہلِ ایمان! ایک دوسرے کا مذاق نہ اڑایا کرو.....'' ﴿وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَکُمْ﴾ ''اور ایک دوسرے کو طعنے مت دیا کرو'' ﴿وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ط﴾ ''اور ایک دوسرے کے چھیڑ کے نام مت رکھو''۔ دوسرے کو چڑانے کے لیے چھیڑ کے نام رکھ دینا بھی قولِ سدید کے خلاف ہے۔ آگے فرمایا: ﴿وَلَا یَغْتَبْ بَّعْضُکُمْ بَعْضًا ط﴾ ''اور ایک دوسرے کی غیبت مت کرو''۔ غیبت جھوٹ نہیں ہوتا۔ غیبت میں آپ اپنے کسی بھائی' دوست' عزیز کی کوئی برائی کسی دوسرے کے سامنے بیان کرتے ہیں جب کہ وہ اُس وقت موجود نہیں ہے اور اپنا دفاع نہیں کر سکتا۔ آپ نے اگرچہ صحیح بات کی ہے لیکن وہ وہاں موجود نہیں۔ آپ نے کوئی جھوٹ نہیں کہا' لیکن اسے غیبت کہا گیا ہے۔ یہ اتنا قبیح عمل ہے کہ اسے اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانے سے تشبیہ دی گئی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ سچ بات کہنے کے لیے بھی پہلے موقع دیکھو۔ اگر جھوٹ ہوتا تو وہ بہتان ہوتا' وہ تو تہمت ہوتی۔ یہاں ایک سچی بات کے بارے میں بھی کہا جا رہا ہے کہ اس سے بھی رک جاؤ' اس لیے کہ اس کا موقع نہیں۔ لہٰذا جس بات کے اندر یہ ساری آلائشیں نہ ہوں وہ ''قولِ سدید'' ہے۔

شادی بیاہ کے معاملے میں سب سے زیادہ جس چیز کی اہمیت ہے وہ زبان کی حفاظت ہے۔ سارا فتنہ وفساد یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا ہتھیار ہے' جسے چلاتے ہوئے کوئی بہت زیادہ تردّد کی بھی ضرورت نہیں ہوتی' لیکن بسا اوقات یہ جا کر اس طرح سے لگتا ہے

کہ دل کے آر پار ہو جاتا ہے اور اس کا لگا ہوا زخم مندمل بھی نہیں ہوتا۔ اسی لیے اس موقع پر زبان کے تقویٰ کا حکم سنایا جا رہا ہے۔ اگر یہ کر لیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ:

﴿یُّصْلِحْ لَکُمْ اَعْمَالَکُمْ وَیَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ ط﴾

''اللہ تمہارے اعمال کی اصلاح کر دے گا اور تمہارے گناہوں کو بھی بخش دے گا''۔

اللہ تعالیٰ تمہارے معاملات کو سنوار دے گا۔ یہ نہیں کہا گیا کہ خود بخود سنور جائیں گے' بلکہ اللہ سنوار دے گا۔ صرف یہی نہیں' بلکہ مغفرت کا پروانہ بھی مل جائے گا۔

آیت کے آخر میں ایک اہم اصول بیان کر دیا گیا کہ دنیا اور آخرت میں عظیم کامیابی کے حصول کے لیے تمہیں اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرنا ہوگی:

﴿وَمَنْ یُّطِعِ اللہَ وَرَسُوْلَہٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِیْمًا ﴿۷۱﴾﴾ (الاحزاب)

''اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کی اطاعت کرتا ہے (اس پر کاربند رہتا ہے) اس نے تو عظیم کامیابی حاصل کر لی''۔

نکاح سُنّتِ نبویؐ ہے!

پھر دو حدیثیں ہیں جو اس موقع پر عام طور سے سنائی جاتی ہیں۔ پہلی حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اَلنِّکَاحُ مِنْ سُنَّتِیْ)) ''نکاح میرا طریقہ ہے''۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کا تقرّب اور اُس کی رضا حاصل کرنے کی خاطر تمہارے لیے یہ راستہ نہیں رکھا گیا کہ تم گھر گرہستی چھوڑ دو' آبادیاں چھوڑ دو' کسی ویرانے میں یا کسی پہاڑ پر تپسیائیں شروع کر دو۔ نہیں! شریعتِ محمدیؐ میں اس کا راستہ یہ ہے کہ تم گھر کی ذمہ داریاں ادا کرو' حقوق اور واجبات ادا کرو۔ اگر تم یہ سب اللہ کی رضا کے حصول کے لیے کر رہے ہو تو یہ تمہارا ایک دینی عمل ہے' یہ تمہاری عبادت ہے۔ اسی لیے آپ ﷺ نے اس کو تقدس (sanctity) عطا فرمایا کہ ((اَلنِّکَاحُ مِنْ سُنَّتِیْ)) ''نکاح میری سُنّت میں سے ہے''۔ ویسے تو نکاح انسان کی طبعی ضرورت بھی ہے' نفسیاتی ضرورت بھی ہے لیکن جب فرمایا کہ ((اَلنِّکَاحُ مِنْ سُنَّتِیْ)) تو ایک اور جہت کا اضافہ ہو گیا کہ اب یہ ایک دینی ضرورت بھی ہے۔

دوسری حدیث جو کہ ایک طویل حدیث کا ٹکڑا ہے' وہ گویا خطرے کی گھنٹی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ)) (متفق علیہ) ''جسے میری

سُنّت پسند نہیں ہے‘ اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔‘‘ اس سے ملتے جلتے الفاظ سنن ابن ماجہ کی (مندرجہ بالا) روایت میں بھی ہیں۔ ((اَلنِّکَاحُ مِنْ سُنَّتِیْ)) کے بعد فرمایا: ((فَمَنْ لَمْ یَعْمَلْ بِسُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ)) (ابن ماجہ:۱۸۱۸) ’’جس نے میری سُنّت پر عمل نہیں کیا‘ اس کا مجھ سے کوئی تعلق ہے۔‘‘ یہ بڑی سخت وعید ہے۔ نبی آخر الزماں حضرت محمدﷺ کے امتی کی حیثیت سے ہم یہ امید لگائے ہوئے ہیں کہ میدانِ حشر میں آپؐ کی شفاعت ہمارے کام آئے گی‘ لیکن رسول اللہﷺ نے پہلے سے نوٹ آف وارننگ دے دیا ہے کہ تم آئے تو شفاعت کا سوچ کر ہو لیکن کیا تمہارا منہ ہے کہ تمہاری شفاعت کی جائے! ساری زندگی تم نے میری سنتوں کو اپنے پیروں تلے پامال کیا۔ صرف نکاح کی سُنّت پر عمل کرنے سے اس حدیث کا تقاضا پورا نہیں ہوتا۔ سنتوں کو من جملہ آپﷺ نے یہ مقام دیا ہے کہ میرے اُمتی ہونے کا تقاضا کیا تھا‘ میرا مشن کیا تھا‘ میری بود و باش کیسی تھی‘ میری وضع قطع کیسی تھی‘ جبکہ تمہارا طرزِ عمل یہ تھا کہ: ؎

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود!

مسلمانوں نے آج اپنا حال یہ بنا رکھا ہے۔ یہ ایک خطرے کی بات بھی ہے لیکن جو لوگ رسول اللہﷺ کا اتباع کرنے اور آپؐ کی سُنّتوں پر عمل کرنے کا ارادہ کر لیں‘ عزم کر لیں ان کے لیے خوش خبری ہے۔ یہ صرف نکاح کی سُنّت کے بارے میں نہیں فرمایا‘ بلکہ یہ پوری زندگی میں رسول اللہﷺ کو اپنا مقتدا اور پیشوا ماننے کی بات ہو رہی ہے۔ آپﷺ کی بود و باش کیسی تھی‘ آپﷺ کی وضع قطع کیسی تھی‘ آپﷺ کی زندگی کا مشن کیا تھا۔ یہ ساری چیزیں مل کر ’’اُسوۂ حسنہ‘‘ بنتی ہیں: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب:۲۱)

اعلانِ نکاح ضروری ہے!

پھر ایک اور حدیث مَیں نے سنائی تھی۔ رسول اللہﷺ نے ارشاد فرمایا: ((اَعْلِنُوْا هٰذَا النِّكَاحَ)) ’’نکاح کا اعلانِ عام کیا کرو۔‘‘ یہ نہیں کہ گھر کے اندر بیٹھ کر دو افراد میاں بیوی بن جائیں‘ بلکہ یہ سب کو پتا ہونا چاہیے کہ فلاں ابن فلاں اور فلاں بنت فلاں رشتہ ازدواج میں منسلک ہو رہے ہیں۔ اگر خاندان نہیں ہے‘ انسان کہیں دور دراز ہے‘ تب بھی کم سے کم دو گواہ ضرور موجود ہوں۔ اس کے بغیر نکاح کا تقاضا پورا نہیں ہوتا۔ ((وَاجْعَلُوْهُ فِي الْمَسَاجِدِ))

’’اور اسے مساجد میں منعقد کیا کرو۔‘‘ یعنی نکاح کی محفل مسجد میں منعقد ہونی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے آج آپ اس فرمان پر عمل بھی کر رہے ہیں۔ اگرچہ اس حصہ حدیث کی سند بہت قوی نہیں ہے لیکن تمام مفسرین و محدثین کے نزدیک مسجد میں نکاح کرنے ہی میں خیر ہے‘ اسی میں برکت ہے۔ اس لیے کہ آپ دعا کے لیے اکٹھے ہوئے ہیں‘ مبارکباد دے رہے ہیں‘ اور اس کے لیے اس سے زیادہ بہتر ماحول ہو نہیں سکتا۔ نماز سے فارغ ہوئے ہیں‘ باوضو یہاں بیٹھے ہوئے ہیں تو امید ہے کہ جو خیر و برکت کی دعا کریں گے وہ اللہ کے ہاں قبول ہو گی۔ ویسے تو نکاح کہیں پر بھی ہو جائے گا‘ لیکن خیر و برکت کی دعا کے لیے مسجد سے بہتر جگہ کوئی نہیں۔

خوشی ضرور منائیں مگر......

حدیث کے آخر میں رسول اللہﷺ نے فرمایا: ((وَاضْرِبُوْا عَلَيْهِ بِالدُّفُوْفِ)) (ترمذی:۱۰۸۹‘ ابن ماجہ:۱۸۹۵) ’’اور اس پر دف بھی بجا لیا کرو۔‘‘ دف بجنے سے اعلان بھی ہو جائے گا اور خوشی منانے کا جو صحیح طریقہ ہے وہ بھی رسول اللہﷺ نے بتا دیا۔ خوشی کا یہ مطلب نہیں کہ آپے سے باہر ہو جاؤ۔ جیسا کہ بدقسمتی سے شادی بیاہ کے موقع پر ہو رہا ہوتا ہے۔ سمجھ نہیں آتا کہ کہاں چلے جاتے ہیں بڑے بزرگ جو کہ سمجھ بھی رکھتے ہیں‘ وہ بھی ایک طرح سے عضو معطل ہو جاتے ہیں۔ ناچ گانا ہو رہا ہے‘ باجے بجائے جا رہے ہیں۔ الغرض اللہ کی معصیت والے تمام کام اسی موقع پر ہو رہے ہیں۔ حالانکہ ایک نئے گھر کی بنا پڑ رہی ہے اور اس کے لیے تو خیر و برکت کی دعا ہونی چاہیے‘ لہٰذا اس کا بھی ادب اور سلیقہ ہے کہ اسے کیسے celebrate کرنا ہے۔ ہمارے دین نے اسے بالکل خشک بھی نہیں بنا دیا۔ رسول اللہﷺ نے دف بجانے کی اجازت دی ہے۔ اس موقع پر بچیاں اگر دف بجا لیں‘ خوشی کے گیت گا لیں تو یہ کوئی بری بات نہیں ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر آلاتِ موسیقی‘ بے پردگی اور بے حیائی یہ وہ چیزیں ہیں کہ جن کی وجہ سے ہمارے اس نیک کام میں بھی بے برکتی پیدا ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ ان باتوں میں سے جو حق بات ہے اس پر ہمیں عمل کرنے کی توفیق عطا فرما دے اور اگر کوئی بات مجھ سے غلط صادر ہوئی ہے تو اللہ مجھے معاف فرما دے اور اسے ہمارے ذہنوں سے محو کر دے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ ربّ العالمین

محرّم الحرام: نئے ہجری سال کا آغاز

ڈاکٹر محمد نجیب قاسمی سنبھلی ☆

محرم الحرام اسلامی سال کا پہلا مہینہ ہے‘ یعنی اس سے ایک نئے ہجری سال کا آغاز ہوتا ہے۔ محرم الحرام ان چار مہینوں میں سے ایک ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے حرمت والے مہینے قرار دیا ہے۔ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا مہینہ ہے۔ یوں تو سارے ہی دن اور مہینے اللہ تعالیٰ کے ہیں لیکن اس نسبت سے محرم کی فضیلت ظاہر ہوتی ہے۔ محرم الحرام کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اس مہینے کا روزہ رمضان المبارک کے بعد سب سے افضل ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں حضور اکرم ﷺ کے پاس بیٹھا ہوا تھا‘ ایک صحابیؓ نے آ کر پوچھا: یا رسول اللہ ﷺ! رمضان کے مہینہ کے بعد کس مہینے کے روزے رکھنے کا آپ مجھے حکم دیتے ہیں؟ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

((اِنْ كُنْتَ صَائِمًا بَعْدَ شَهْرِ رَمَضَانَ فَصُمِ الْمُحَرَّمَ فَاِنَّهٗ شَهْرُ اللّٰهِ، فِيْهِ يَوْمٌ تَابَ اللّٰهُ فِيْهِ عَلٰى قَوْمٍ وَيَتُوْبُ فِيْهِ عَلٰى قَوْمٍ آخَرِيْنَ))

(سنن الترمذی ۱/۱۵۷)

’’اگر رمضان کے مہینہ کے بعد تم کو روزہ رکھنا ہو تو محرم کا روزہ رکھو‘ اس لیے کہ یہ اللہ تعالیٰ (کی خاص رحمت) کا مہینہ ہے۔ اس میں ایک دن ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے ایک قوم کی توبہ قبول فرمائی‘ اور آئندہ دوسرے لوگوں کی توبہ بھی قبول فرمائیں گے۔‘‘

جس قوم کی توبہ قبول ہوئی وہ بنی اسرائیل ہے۔ اس کی وضاحت ایک دوسری حدیث میں ہے کہ عاشورہ (۱۰ محرم الحرام) کے دن اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو فرعون اور اس کے لشکر سے نجات دی تھی۔

یومِ عاشورہ بڑا ہی مہتم بالشان اور عظمت کا حامل دن ہے‘ تاریخ کے عظیم واقعات اس سے جڑے ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں نبی کریم ﷺ سے بھی اس دن کی متعدد فضیلتیں وارد

☆ ای میل: www.najeebqasmi.com

ہیں۔ چنانچہ:

(۱) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

مَا رَاَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَتَحَرّٰى صِيَامَ يَوْمٍ فَضَّلَهٗ عَلٰى غَيْرِهٖ اِلَّا هٰذَا الْيَوْمَ يَوْمَ عَاشُوْرَاءَ وَهٰذَا الشَّهْرَ يَعْنِيْ شَهْرَ رَمَضَانَ

(صحیح البخاری ۱/۲۶۸، صحیح مسلم ۱/۳۶۰،۳۶۱)

’’میں نے نبی کریم ﷺ کو کسی فضیلت والے دن کے روزہ کا اہتمام بہت زیادہ کرتے نہیں دیکھا‘ سوائے اِس دن یعنی یومِ عاشوراء کے‘ اور سوائے اس ماہ یعنی ماہِ رمضان المبارک کے۔‘‘

گویا حضرت ابن عباسؓ نے آپ ﷺ کے طرزِ عمل سے یہی سمجھا کہ نفل روزوں میں جس قدر اہتمام آپؐ یومِ عاشورہ کے روزہ کا کرتے تھے‘ اتنا کسی دوسرے نفلی روزہ کا نہیں کرتے تھے۔

(۲) حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اِنِّي أَحْتَسِبُ عَلَى اللهِ أَنْ يُكَفِّرَ السَّنَةَ الَّتِي قَبْلَهُ))

(صحیح مسلم ۱/۱۵۷، سنن ابن ماجہ: ۱۲۵)

’’مجھے امید ہے کہ عاشوراء کے دن کا روزہ گزشتہ سال کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا۔‘‘

(ابن ماجہ کی ایک روایت میں ”السَّنَةَ الَّتِي بَعْدَهَا“ کے الفاظ ہیں۔ کذافی الترغیب ۲/۱۱۵)

صومِ عاشوراء کے ضمن میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ احادیث میں نبی کریم ﷺ نے کفار و مشرکین کی مشابہت اور یہود و نصاریٰ کی بود و باش اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے۔ اس حکم کے تحت چونکہ تنہا یومِ عاشوراء کا روزہ رکھنا یہودیوں کے ساتھ اشتراک اور تشابہ تھا‘ دوسری طرف اس کو چھوڑ دینا اس کی برکات سے محرومی کا سبب تھا‘ اس لیے اللہ کے رسول ﷺ نے ہمیں یہ تعلیم دی کہ یومِ عاشوراء کے ساتھ ایک دن کا روزہ اور ملا لو۔ بہتر تو یہ ہے کہ نویں اور دسویں تاریخ کا روزہ رکھو‘ اور اگر کسی وجہ سے نویں کا روزہ نہ رکھ سکو تو پھر دسویں کے ساتھ گیارہویں کا روزہ رکھ لو‘ تاکہ یہود کی مخالفت ہو جائے اور ان کے ساتھ کسی بھی قسم کا تشابہ نہ رہے۔

مذکورہ بالا احادیث شریفہ سے ظاہر ہے کہ یومِ عاشوراء بہت ہی عظمت و تقدس کا حامل ہے‘ لہٰذا ہمیں اس دن کی برکات سے بھرپور فیض اٹھانا چاہیے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی سال کی ابتدا محرم الحرام سے ہی کیوں کی گئی جبکہ

مدینہ منورہ کی طرف نبی اکرم ﷺ کی ہجرت ربیع الاول میں ہوئی تھی۔ اس حوالے سے چند ایسے امور ملاحظہ فرمائیں جن کے متعلق تقریباً تمام مؤرخین متفق ہیں:

۱) ہجری سال کا استعمال نبی اکرم ﷺ کے عہد میں نہیں تھا‘ بلکہ یہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے مشورے کے بعد ۱۷ ہجری میں شروع ہوا۔

۲) ہجری سال کے کیلنڈر کا افتتاح اگرچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ہوا تھا‘ مگر تمام بارہ اسلامی مہینوں کے نام اور ان کی ترتیب نہ صرف نبی اکرم ﷺ کے زمانے‘ بلکہ عرصۂ دراز سے چلی آ رہی تھی۔ ان میں سے حرمت والے چار مہینوں (ذوالقعدہ‘ ذوالحجہ‘ محرم الحرام اور رجب المرجب) کی تحدید بھی زمانۂ قدیم سے چلی آ رہی تھی۔ اللہ تعالیٰ اپنے پاک کلام میں ارشاد فرماتا ہے:

﴿اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ۭ﴾ (التوبة:۳۶)

’’مہینوں کی گنتی اللہ کے نزدیک کتاب اللہ میں بارہ کی ہے اسی دن سے جب سے آسمان وزمین کو اس نے پیدا کیا ہے‘ ان میں سے چار مہینے حرمت والے ہیں۔‘‘

۳) اسلامی کیلنڈر (ہجری) کے اجراء سے قبل عربوں میں مختلف واقعات سے سال کو موسوم کیا جاتا تھا‘ جس کی وجہ سے عربوں میں مختلف کیلنڈر رائج تھے‘ البتہ ہر کیلنڈر کی ابتدا محرم الحرام ہی سے ہوتی تھی۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں جب ایک نیا اسلامی کیلنڈر شروع کرنے کی بات آئی تو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اسے نبی اکرم ﷺ کی ولادت‘ یا آغازِ نبوت‘ یا ہجرتِ مدینہ سے شروع کرنے کے مشورے دیے۔ آخر میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے مشورہ سے ہجرتِ مدینہ منورہ کے سال کو بنیاد بنا کر ایک نئے اسلامی کیلنڈر کا آغاز کیا گیا۔ رہی مہینوں کی ترتیب تو چونکہ عربوں میں محرم الحرام قدیم زمانے سے سال کا پہلا ہی مہینہ رہتا تھا‘ لہٰذا اسلامی سال کو شروع کرتے وقت اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔

شمسی نظام کے تحت عیسوی کیلنڈر میں ۳۶۵ یا ۳۶۶ دن ہوتے ہیں‘ جبکہ قمری نظام کے تحت ہجری کیلنڈر میں ۳۵۴ دن ہوتے ہیں۔ ہر کیلنڈر میں ۱۲ ہی مہینے ہوتے ہیں۔ ہجری

کیلنڈر میں مہینہ ۲۹ یا ۳۰ دن کا ہوتا ہے جبکہ عیسوی کیلنڈر میں سات مہینے ۳۱ دن کے‘ چار ماہ ۳۰ دن اور ایک ماہ ۲۸ یا ۲۹ دن کا ہوتا ہے۔ سورج اور چاند دونوں کا نظام اللہ ہی نے بنایا ہے۔ شریعت اسلامیہ میں متعدد عبادتیں رویتِ ہلال سے مربوط ہیں۔ دونوں کیلنڈر میں سالانہ ۱۰ یا ۱۱ روز کا فرق ہونے کی وجہ سے ان عبادتوں کا وقت ایک موسم سے دوسرے موسم میں تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ یہ موسموں کی تبدیلی بھی اللہ تعالیٰ کی نشانی ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ۝۱۹۰ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰي جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝۱۹۱﴾ (آل عمران)

’’بے شک آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات اور دن کے باری باری آنے جانے میں اُن عقل والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں‘ جو اُٹھتے بیٹھتے اور لیٹے ہوئے (ہر حال میں) اللہ کو یاد کرتے ہیں‘ اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق پر غور کرتے ہیں‘ (اور انہیں دیکھ کر بول اُٹھتے ہیں کہ) اے ہمارے پروردگار! آپ نے یہ سب کچھ بے مقصد پیدا نہیں کیا۔ آپ (ایسے فضول کام سے) پاک ہیں‘ پس ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا لیجیے۔‘‘

آیئے نئے ہجری سال کی آمد پر ہم عزم مصمم کریں کہ زندگی کے جتنے ایام باقی ہیں‘ ان میں ان شاءاللہ اپنے مولا کو راضی رکھنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔ ابھی ہم بقیدِ حیات ہیں اور موت کا فرشتہ ہماری جان نکالنے کے لیے کب آ جائے‘ معلوم نہیں۔ حضور اکرم ﷺ کا یہ ارشاد ہمیشہ ہمارے پیش نظر رہنا چاہیے:

((اِغْتَنِمْ خَمْسًا قَبْلَ خَمْسٍ: شَبَابَكَ قَبْلَ هَرَمِكَ، وَصِحَّتَكَ قَبْلَ سَقَمِكَ، وَغِنَاءَكَ قَبْلَ فَقْرِكَ، وَفَرَاغَكَ قَبْلَ شُغْلِكَ، وَحَيَاتَكَ قَبْلَ مَوْتِكَ)) (أخرجه الحاكم في المستدرك، وصححه الألباني في صحيح الجامع)

’’پانچ امور سے قبل پانچ اُمور سے فائدہ اٹھایا جائے: بڑھاپا آنے سے قبل جوانی سے‘ مرنے سے قبل زندگی سے‘ مصروفیت سے قبل فراغت سے‘ غربت آنے سے قبل مال سے‘ بیماری سے قبل صحت سے۔‘‘

اسی طرح حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَا تَزُولُ قَدَمَا ابْنِ آدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حَتّٰى يُسْأَلَ عَنْ خَمْسٍ: عَنْ عُمُرِهِ فِيْمَا أَفْنَاهُ ، وَعَنْ شَبَابِهِ فِيْمَا أَبْلَاهُ ، وَعَنْ مَالِهِ مِنْ أَيْنَ اكْتَسَبَهُ، وَفِيْمَا أَنْفَقَهُ ، وَمَاذَا عَمِلَ فِيْمَا عَلِمَ؟)) (رواه الترمذي)

''قیامت کے دن کسی انسان کے قدم (اللہ تعالیٰ کے سامنے سے) ہٹ نہیں سکتے یہاں تک کہ وہ ان سوالات کا جواب نہ دے دے: زندگی کہاں گزاری؟ جوانی کہاں لگائی؟ مال کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا؟ جو علم حاصل کیا اس پر کتنا عمل کیا؟''

ہمیں اپنی زندگی کا حساب اپنے خالق و مالک کو دینا ہے جو ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے' جو پوری کائنات کا پیدا کرنے والا ہے اور پوری دنیا کے نظام کو تن تنہا چلا رہا ہے۔

عموماً ہمیں گزشتہ برس کے چند اچھے دن اور کچھ تکلیف دہ لمحات یاد رہ جاتے ہیں جبکہ باقی دن اس طرح بھلا دیے جاتے ہیں کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ ہجری سال کے اختتام پر ہمیں یہ محاسبہ کرنا چاہیے کہ ہمارے نامۂ اعمال میں کتنی نیکیاں اور کتنی برائیاں لکھی گئیں۔ کیا ہم نے امسال اپنے نامۂ اعمال میں ایسے نیک اعمال درج کرائے کہ قیامت کے دن ان کو دیکھ کر ہم خوش ہوں اور جو ہمارے لیے دنیا وآخرت میں نفع بخش بنیں؟ یا ہماری غفلتوں اور کوتاہیوں کی وجہ سے ایسے اعمال ہمارے نامۂ اعمال میں درج ہو گئے جو ہماری دنیا وآخرت کی ناکامی کا ذریعہ بنیں گے؟ ہمیں اپنا محاسبہ کرنا ہوگا کہ امسال اللہ کی اطاعت میں بڑھوتری ہوئی یا کمی آئی! ہماری نمازیں' روزے اور صدقات وغیرہ صحیح طریقہ سے ادا ہوئے یا نہیں؟ ہماری نمازیں خشوع وخضوع کے ساتھ ادا ہوئیں؟ روزوں کی وجہ سے ہمارے اندر اللہ کا خوف پیدا ہوا یا صبح سے شام تک صرف بھوکا رہنا پڑا؟ یتیموں اور بیواؤں کا خیال رکھا یا نہیں؟ ہمارے معاملات میں تبدیلی آئی یا نہیں؟ ہمارے اخلاق نبی اکرم ﷺ کے اخلاق کا نمونہ بنے یا نہیں؟ جو علم ہم نے حاصل کیا تھا وہ دوسروں کو پہنچایا یا نہیں؟ اپنے بچوں کی اُخروی کامیابی کے لیے کچھ اقدامات بھی کیے یا صرف ان کی دنیاوی تعلیم اور سہولیات فراہم کرنے ہی کی فکر کرتے رہے؟ انسانوں کو ایذائیں پہنچائی یا ان کی راحت رسانی کے انتظام کیے؟ قرآن کریم کے ہمارے اوپر جو حقوق ہیں وہ ادا کیے یا نہیں؟ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کی یا نافرمانی؟ ہمارے پڑوسی ہماری تکلیفوں سے محفوظ رہے یا نہیں؟ والدین' پڑوسی اور رشتہ داروں کے حقوق ادا کیے یا نہیں؟

❁❁❁

نوجوان مسلم اور مسئلہ فلسطین

ریان بن نعمان اختر☆

کسی قوم کی تعمیر میں نوجوانوں کا کردار بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔قومی سلامتی و ترقی نوجوانوں کے تعاون کے بغیر تقریباً ناممکن ہے۔قوموں کے عروج و زوال' ترقّی و تنزّلی اور استحکام و انتشار میں نوجوانوں کا رویہ اظہر من الشمس ہے۔کسی بھی علاقے کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجیے' یہ نوجوان طبقہ ہی ہے جس نے معماری کے فرائض سرانجام دیے اور اپنی قوم کی اُٹھان میں کلیدی کردار ادا کیا۔نوجوان اپنے اندر گرم خون رکھتا ہے' کسی نظریے پر ایک بار دل ٹھک جائے تو اپنا سب کچھ اس پر لگا دینے حتیٰ کہ جان تک نچھاور کر دینے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ مصلحتیں' تعصّبات اور مفادات اس کے جذبوں' امنگوں اور حوصلوں کی گرمائش کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔اگر اسے ابتدا ہی سے نیک صحبت' قرآن و صاحبِ قرآن ﷺ سے تعلق' دین کی صحیح سمجھ اور فکر' حق و باطل میں تمیز کرنے والا علمِ نافع' حق پر چلانے والے شفیق ہاتھ اور قلوب کو اُمّت کے درد سے بھر دینے والے صالح مربّیین میسّر آ جائیں تو اُمّتِ پریشاں کو ایک مضبوط کندھا فراہم ہو جاتا ہے۔

خالقِ کائنات نے اپنے کلامِ لاریب میں نوجوانی کے دور کو زیب و زینت سے تعبیر کیا ہے (الحدید:۲۰)۔مراد یہ ہے کہ دیگر ادوارِ زندگی کی بنسبت اس عمر میں انسان کا فطری و طبعی میلان زیب و زینت اور آرائش و زیبائش کی طرف بہت زیادہ ہوتا ہے۔اگر اس رجحان میں زیادتی حدود کو تجاوز کر جائے تو پھر انسان دینی' قومی اور اخلاقی تقاضوں سے غفلت برتتے ہوئے ع ''اپنے ہی حسن کا دیوانہ بنا پھرتا ہوں'' کے مصداق اپنے مال و جان اور صلاحیتوں کا بہتر و بیشتر حصہ دُنیوی چمک دمک کے حصول اور تعیّشات کی فراہمی میں ضائع کر دیتا ہے۔اسے ہر دم اپنے ظاہری حلیے کی تو فکر دامن گیر رہتی ہے مگر باطنی احوال کی اصلاح اور روحانی عیوب کے تدارک کا

☆ متعلم' قرآن اکیڈمی' کراچی

کوئی ہوش نہیں رہتا۔وہ مخلوق کے درمیان اپنی عزت و تکریم کا تو خواہش مند رہتا ہے مگر خالق کی نگاہ میں اس کا کیا مقام ہے' اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ظاہری چال ڈھال' طرزِ لباس اور نشست و برخاست کے طریقوں میں تو عرف (ٹرینڈ/فیشن) کا خوب خیال رکھتا ہے مگر اپنے اخلاق کی تصحیح' فکر کی تطہیر اور اعمال کی تعمیر کی طرف کوئی توجہ نہیں رکھتا۔کسی قوم کے نوجوانوں کی اکثریت کا حال جب یہ ہو جائے کہ توجہات کا ارتکاز روح کے بجائے جسم پر اور حیاتِ اُخروی کے بجائے حیاتِ دنیوی پر ہو جائے تو مسبّب الاسباب کے سوا کوئی سبب اس قوم کو تنزلی سے نہیں بچا سکتا۔

جنگ اُحد کے بعد مسلمان اپنے شہداء کی تدفین میں مصروف ہیں۔ایک نوجوان کا لاشہ آقائے دو جہاں ﷺ کی خدمتِ اقدس میں لایا جاتا ہے۔اس کی حالت یہ ہے کہ جسمِ اطہر پر فقط ایک چادر ہے اور وہ بھی اتنی چھوٹی کی پاؤں ڈھانکیں تو سر کھل جائے اور سر ڈھانپیں تو پاؤں کھل جائیں۔حضورِ اقدس ﷺ کی آنکھیں آبدیدہ ہو جاتی ہیں اور آپ ﷺ رندھی ہوئی آواز میں فرماتے ہیں کہ اس کا سر ڈھانپ دو جبکہ پاؤں پر گھاس پھوس ڈال دو۔یہ عظیم نوجوان کون ہے؟ راہِ بہشت کا یہ مسافر کون ہے کہ جس نے مختصر سی عمر میں اپنی منزلِ مقصود پا لی؟ یہ کون مجذوب ہے کہ جس نے اپنی نوجوانی' اپنا گھر بار' تعیّشات و تن آسانیاں' دنیوی رونقیں غرض اپنا سب کچھ راہِ عشق میں لگا دیا؟ ارے یہ تو وہی ہے کہ جس کے کپڑے شام اور یمن سے سِل کر آتے تھے۔یہ تو وہی ہے جو ایک جوڑا دوسری بار نہیں پہنتا تھا۔ہاں ہاں یہ وہی ہے جو خوشبو ایسی لگاتا تھا کہ جس گلی سے گزر جاتا' لوگ سمجھ جاتے کہ کون گزر رہا ہے۔لازوال حسن کا مالک' دل نشین آواز کا حامل' مضبوط اعصاب رکھنے والا۔نبی اکرم ﷺ سے انتہائی مشابہ باوقار چہرہ! یہ حضرت مصعب بن عمیر ؓ ہیں جو قبل از قبولِ اسلام دنیا پرست نوجوانوں کے آئیڈیل تھے مگر بعد از قبولِ اسلام خدا پرست نوجوانوں کے لیے روشن نمونہ ٹھہرے۔ان کی دعوتِ قرآن مجید نے یثرب کو مدینۃ النبیؐ بننے کا شرف بخشا۔یہ تو ایک مثال ہے' ورنہ صحابہ کرامؓ میں حضرت علی ؓ جیسے نوجوان بھی ہیں جو فقہاءِ صحابہؓ میں شمار ہوتے ہیں۔سلمان فارسیؓ' خالد بن ولیدؓ (سیفٌ مِن سُیوفِ اللّٰہ)' زید بن حارثہؓ' جعفرِ طیّارؓ سمیت سینکڑوں صحابہ کرام ؓ ہیں جنہوں نے نوجوانی کا حق ادا کیا اور اسلام کی بھرپور خدمت کی۔

تاریخِ اسلامی کا ایک ادنیٰ سا طالبِ علم بھی یہ بات بخوبی جانتا ہے کہ نبی مکرم ﷺ پر ابتداءً ایمان لانے والوں میں دو طبقے بہت نمایاں تھے: غلام اور نوجوان ۔ دورِ صحابہؓ کے بعد اُمت بانجھ نہیں ہوگئی بلکہ مسلم فاتحین کی فہرست پر اگر نگاہ ڈالی جائے تو محمد بن قاسمؒ سے صلاح الدین ایوبیؒ تک اور طارق بن زیادؒ سے سلطان محمد فاتحؒ تک نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد نظر آئے گی۔ ان کے ناموں سے کفر کے ایوانوں میں لرزہ طاری رہتا تھا۔ بلند مقاصد‘ پختہ عزائم‘ عبقری ذہانت‘ عقابی نگاہ‘ پاکیزہ اخلاق‘ خوفِ خدا‘ حُبِ رسول ﷺ اور فکرِ آخرت رکھنے والے یہ نوجوان اقبال کے شاہین کی تمام صفات سے متصف اور ان اشعار کا مصداق تھے: ؎

نگہ بلند‘ سخن دل نواز‘ جاں پُرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

اور: ؎

محبّت مجھے اُن جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

ان کے دن گھوڑوں کی پیٹھوں پر دشمنانِ اسلام کے تعاقب میں گزرتے اور راتیں اپنے پروردگار کے حضور گریہ وزاری میں صَرف ہوتیں۔ ہاتھ حالات کی نبض پر ہوتے اور پاؤں اعدائے خالق ومخلوق کی گردنوں پر۔ مفتوحین ان کے آنے پر دروازے کھول کر استقبال کرتے اور جانے پر دھاڑیں مار مار کر رویا کرتے تھے۔ ان کے نفوس ہر قسم کی آلائشوں سے پاک صاف اور نورِ ایمان سے منور تھے۔ ارواح ان کے اجسام پر غالب ہوتیں۔ شاید انہی کے لیے جگر مراد آبادی نے کہا تھا کہ: ؎

اپنا زمانہ آپ بناتے ہیں اہلِ دل
ہم وہ نہیں کہ جن کو زمانہ بنا گیا

آہ!! آج کہاں ڈھونڈیں ایسے بُت شکنوں کو۔ ع ’’اب انہیں ڈھونڈ چراغِ رُخِ زیبا لے کر!‘‘ آج مسلمانوں میں نوجوانوں کی بڑی تعداد موجود ہے مگر ’’ابلیس کی مجلسِ شوریٰ‘‘ میں ابلیس سے منسوب اس بیان کے مطابق کہ ؎

خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشکِ سحر گاہی سے جو ظالم وضو

جواں مرد بہت کم ہیں۔ وہ اعلیٰ مقاصد‘ بلند حوصلے اور پختہ سیرت جن کے حامل ہمارے اسلاف تھے‘ آج ہم میں مفقود ہیں‘ اِلّا ماشاءاللہ! اسی کا شاخسانہ ہے کہ آج سسکتی اُمتِ مُسلمہ کا کوئی پُرسانِ حال اور پستی میں گرتے مسلمانوں کو کوئی مضبوط سہارا میسر نہیں ہے۔ بقولِ اقبال ؎

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے
وہ دل‘ وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہے‘ تُو باقی نہیں ہے

صلاح الدین ایوبیؒ اور محمد بن قاسمؒ کی تعریفیں کرنا‘ ان کی بہادری کے گُن گانا اور ان کے مثل بہادروں کی پیدائش کی دعا کرنا بہت آسان ہے مگر خود ان عظیم ہستیوں کے اوصاف اپنانا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ درحقیقت یہی وقت کی اصل ضرورت ہے۔ علامہ اقبال نے اسی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہا:

کبھی اے نوجواں مسلم! تدبّر بھی کیا تُو نے
وہ کیا گردوں تھا تُو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا!

آج بیشتر نوجوانوں کا پسندیدہ مشغلہ آوارہ گردی کرنا رہ گیا ہے۔ دنیوی آسائشات کے حصول میں ’’Never Settle For Less‘‘ کے نعرے ہیں مگر نیکی کے میدان میں کم سے کم پر مکتفی ہیں۔ وہ علم جو انسان کو ترفع بخشتا ہے‘ بصیرت عطا کرتا ہے‘ حق و باطل کی تمیز سکھاتا ہے‘ ’’تزکیہ وتصفیۂ قلب اور تجلیۂ روح‘‘ کا کام کرتا ہے‘ غرض انسان کی صحیح رخ پر تربیت کر کے ایک متوازن شخصیت تشکیل دیتا ہے‘ اب ہمارے تعلیمی اداروں سے اٹھ چکا ہے۔ علامہ اقبال نے اسی کا نوحہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ: ؎

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ!

اور بقول اکبر الٰہ آبادی ؎

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی!

فی زمانہ ایسی نوجوان نسل تیار ہو رہی ہے جو نہ اپنے مذہب اسلام سے مخلص ہے اور نہ اپنے

وطن پاکستان سے۔ اسلام کے نام سے اسے ایک طرح کی ناگواری محسوس ہوتی ہے۔ ’’پاکستان زندہ باد‘ کے بجائے وہ ’’پاکستان سے زندہ بھاگ‘‘ کی قائل ہے۔ ان کے معمولات‘ طرزِ تکلّم‘ بود وباش‘ طرزِ فکر مغربی تہذیب سے مرعوب نظر آتے ہیں۔ انہیں نہ تو اُمّتِ مُسلمہ کی حالت سے کوئی سروکار ہے‘ نہ مملکتِ خداداد پاکستان کے مسائل سے کسی قسم کی دلچسپی۔ بس وہ اپنی ذات میں مگن ہیں۔ علامہ اقبال نے شاید اسی کیفیت کی غمازی کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

وائے ناکامی! متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

رواں سال کو اُمّتِ مُسلمہ کے لیے ’’عام الحزن‘‘ کی مانند قرار دیا جاسکتا ہے۔ ایک قیامت ہے کہ جو فلسطینی بھائیوں‘ بہنوں اور بچوں پر بیت رہی ہے۔ درندے ہمارے جسدِ ملی کے ایک حصے کو بھنبھوڑ رہے ہیں اور مسلمانوں کے مقتدر طبقات بے غیرتی و بے حسی کی اعلیٰ مثالیں قائم کرتے ہوئے کفِ دست پر ٹھوڑی رکھے تماش بین بنے ہوئے ہیں۔ عوام الناس کی اکثریت میں بھی اسرائیل نواز کمپنیوں کے بائیکاٹ کا جذبہ ماند پڑتا جارہا ہے۔ اگر کسی کی ٹانگ میں جنگلی جانور نے اپنے دانت گاڑے ہوئے ہوں تو کیا متاثرہ شخص کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھی جاسکتی ہے؟ ہرگز نہیں! اس کا چہرہ درد وغم کا ترجمان جبکہ اعضاء اس اذیت سے نجات پانے میں مصروفِ عمل ہوں گے۔ تو کیا کسی باغیرت نوجوان نے اس عید پر دلی مسرت محسوس کی ہوگی؟ ناممکن! اس کو تو یہ غم کھاتا رہا ہوگا کہ اہلِ غزہ پر کیا قیامت خیز لمحات بیت رہے ہیں! جب وہ عید کے موقع پر پُرتکلف کھانوں اور مشروبات سے لطف اندوز ہو رہا تھا تو فلسطینی بچے کس بھوک و افلاس سے گزر رہے تھے! ان کے لیے کیا عید کی خوشی اور کیسی عید کی رونقیں!

دوسری جانب حماس کے مجاہدین ہیں کہ جن کی اکثریت نوجوانوں پر مشتمل ہے۔ ایمان و یقین‘ عزیمت و استقامت‘ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ کی عملی تصویر‘ اسلام واہلِ اسلام کے حقیقی محافظ۔ یہ دورِ حاضر میں صلاح الدین ایوبی کی معنوی اولاد‘ میراثِ ابنِ قاسم کے اصل وارث اور طارق ابنِ زیاد کے حقیقی جانشین گردانے جانے کے لائق ہیں۔ عموماً دنیا پرست جماعتوں کی قیادت اپنے مفادات کے حصول کے لیے دوسروں کو استعمال کرتی ہے۔ جان ومال کی قربانیاں تو کوئی اور دے رہا ہوتا ہے مگر اوپر والے ٹھنڈ میں رہتے ہوئے بھی ساری ملائی خود

سمیٹ لے جاتے ہیں‘ مگر حماس کے معاملے میں ہم دیکھتے ہیں کہ جو جتنا زیادہ ذمہ دار ہے وہ اتنی ہی زیادہ قربانیاں دے رہا ہے۔ حماس کے سربراہ اسماعیل ہنیہ نے بشمول اپنے تین کڑیل جوان بیٹوں کے‘ اپنے خاندان کے دس افراد اس طوفان الاقصیٰ آپریشن میں کھوئے‘ مگر خود عزم وہمت کا پہاڑ ثابت ہوئے کہ اپنے بچوں کی شہادت کی اطلاع پاکر کلمۂ حمد ادا کیا اور شہداء کا باپ ہونے پر اظہارِ فخر کیا۔ ان کے یہ تین بیٹے مجاہدینِ حماس کے شانہ بشانہ اپنی جان ہتھیلی پر لیے میدانِ جہاد میں سرگرمِ عمل تھے۔ سلام ہو ایسی نوجوانیوں پر! ہماری ہزاروں جوانیاں ان کے ایک ایک نوجوان پر قربان کہ جن کی جوانی دورِ حاضر میں نوجوانوں کے لیے مشعلِ راہ ہے۔

ہماری عید تو تب ہوگی جب ہم مسجدِ اقصیٰ میں آزادانہ نماز پڑھ سکیں۔ ہماری عید تو تب ہوگی جب ہم اسرائیل کے ناجائز وناپاک وجود کو اس دھرتی سے پاک کرسکیں۔ ہماری عید تو تب ہوگی جب ہم دنیا بھر کے مظلوم مسلمانوں کو عید کی خوشیوں میں شامل کرسکیں۔ ہماری عید تو تب ہوگی جب ہم اسلامی ریاست کی ٹھنڈی چھاؤں میں اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کی بہاریں دیکھتے ہوئے عید کی حقیقی مسرتیں سمیٹ سکیں۔ فی الحال عید اپنے ساتھ وقتی مسرت تو لاتی ہے‘ دائمی خوشی نہیں۔ عارضی فرحت تو بخشتی ہے‘ پائیدار اطمینان نہیں۔ جب کام باقی ہو تو آرام کا جواز نہیں رہتا۔ جب مقصد نامکمل ہو تو خوشیاں بھی ادھوری رہتی ہیں۔ بقول جگر مرادآبادی ؎

جھوٹی ہے ہر ایک مسرّت
روح اگر تسکین نہ پائے

کاش کہ ہمارے نوجوان اس دور کی نزاکتوں کا ادراک کرکے لہو ولعب ترک کریں اور سنجیدہ پن کا مظاہرہ کریں۔ اپنے فکر کی تطہیر اور اعمال کی تعمیر پر توجہ دیں۔ قرآن‘ صاحبِ قرآن ﷺ واہلِ قرآن سے اپنے تعلق کو مضبوط کریں۔ پھر کوئی عجب نہیں کہ اس اُمّت کو وہ مضبوط سہارے فراہم ہوں کہ جو اس کو پستیوں سے نکال کر اوجِ ثریا تک پہنچائیں۔ جیسے اُمّتِ مُسلمہ کے عروجِ اوّل میں نوجوانوں نے قیادت کی‘ اسی طرح عروجِ ثانی میں بھی نوجوان ہراول دستے کا کردار ادا کریں گے‘ ان شاء اللہ! علامہ اقبال نے ایسے ہی حالات کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا تھا کہ ؎

وقتِ فرصت ہے کہاں‘ کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اِتمام ابھی باقی ہے!

پلٹنا اللہ کو محبوب ہے مگر نوجوانی میں توبہ کا تو معاملہ ہی جدا ہے۔ بقولِ شاعر ع ’’در جوانی توبہ کردن شیوۂ پیغمبری‘‘ (نوجوانی میں اللہ کی طرف پلٹنا حضراتِ انبیاءؑ کا طریقہ ہے۔)

حدیثِ مبارکہ کے مطابق روزِ قیامت ابنِ آدم کے قدم ہل نہ سکیں گے جب تک کہ وہ پانچ سوالات کے جوابات نہ دے دے۔ ان میں سے دو سوالات زندگی سے متعلق ہیں۔ ایک یہ کہ زندگی کہاں لگائی؟ تمہارا رخِ حیات کیا تھا؟ تمہاری شب و روز کی جِدّ و جُہد کے پیچھے کیا افکار‘ عوامل اور مقاصد کارفرما تھے؟ دوسرا سوال دنیوی زندگی کے سب سے اہم دور نوجوانی سے متعلق کہ جس میں انسان ہر وہ کام کرسکتا ہے جو وہ چاہے‘ اچھے سے اچھا بھی اور برے سے برا بھی۔ جب ذہن میں پنپنے والے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جسمانی قوتیں اس کی معاون ہوتی ہیں۔ وہ دورِ جوانی کہاں لگایا؟

اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہمیں اور ہمارے نوجوانوں کو ان سوالات کے جواب تیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ قلب میں اُمّت کا درد عطا فرمائے اور حالات کی تاریکیوں سے مایوس ہونے کے بجائے اُمّت کی رہبری کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یاربّ العالمین!

بانیٔ تنظیمِ اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ رفقاءِ تنظیم کے جذبوں کو مہمیز دیتے ہوئے اکثر رئیس امروہوی کے یہ اشعار پڑھا کرتے تھے ؎

وہ وقت آیا کہ ہم کو قدرت ہماری سعی و عمل کا پھل دے
بتا رہی ہے یہ ظلمتِ شب کہ صبح نزدیک آ رہی ہے
ابھی ہیں کچھ امتحان باقی‘ فلاکتوں کے نشان باقی
قدم نہ پیچھے ہٹیں کہ قسمت ابھی ہمیں آزما رہی ہے
سیاہیوں سے حزیں نہ ہونا‘ غموں سے اندوہ گیں نہ ہونا
انہی کے پردے میں زندگی کی نئی سحر جگمگا رہی ہے
رئیسؔ اہلِ نظر سے کہہ دو کہ آزمائش سے جی نہ ہاریں
جسے سمجھتے تھے آزمائش وہی تو بگڑی بنا رہی ہے!

❁❁❁

خلیفہ ثانی سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ

سیدہ حفظہ احمد

کیا آپ ایسے شخص کو جانتے ہیں:

☆ جو اپنے عہد میں عرب کے سترہ پڑھے لکھے لوگوں میں شمار ہوتا ہو؟

☆ جو قبولِ اسلام سے پہلے پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف بولتا ہو؟ دل میں بغض لیے کہتا ہو کہ یہ تو شاعر ہے (نعوذ باللّٰہ من ذلک)، جس کے جواب میں قرآن جیسی مقدس کتاب یہ کہتی ہو: ﴿وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ۭ﴾ (الحاقۃ:۴۱) جب وہ سوچتا ہو کہ یہ تو بڑا کاہن ہے (نعوذ باللّٰہ من ذلک) تو قرآن جواب دیتا ہو: ﴿وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ۭ﴾ (الحاقۃ:۴۲) اُس وقت اُس کے دل میں اسلام کا رعب و دبدبہ پیوست ہو جاتا ہو؟

☆ جو نبی مکرم ﷺ کو قتل کرنے کے ارادے سے نکلا ہو لیکن سورۃ طٰہٰ کی آیت ﴿اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ﴾ سن کر کانپ جاتا ہو۔ پھر دوڑتا ہوا نبی محترم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا ہو کہ آج میں بری نیت لے کر نہیں آیا۔

☆ جو نبی اکرم ﷺ کی دعاؤں کا ثمر ہو؟

☆ جس کے اسلام قبول کرنے کے بعد دین کو تقویت ملی ہو اور وہ مسلمانوں کی عزت کا سبب بنا ہو؟

☆ جس نے علی الاعلان کعبہ کی چھت پر پہلی بار اذان دی ہو؟

☆ جو اسلام سے پہلے اپنے رعب سے متاثر کرتا ہو لیکن اسلام لانے کے بعد نبی عربی ﷺ کا خادم بن گیا ہو؟

☆ جو اسلام قبول کرنے کے بعد ایک کافر کے گھر جا کر اسے پکار کر بتاتا ہو کہ میں اسلام قبول کر چکا ہوں۔ جس نے بیوی کو بیوہ، بچوں کو یتیم، ماں باپ کی کمر کو جھکانا ہو تو وہ میرے مقابلے میں آئے۔

☆ جس کو دیکھ کر شیطان اپنا راستہ بدل لیتا ہو؟

☆ جو اس بات کے ڈر سے کہ قرآن میں پہلی کتابوں کی طرح تحریف نہ ہو جائے، اس کے بکھرے ہوئے حصّوں کو ایک جلد میں جمع کرنے کا مشورہ دیتا ہو؟

☆ جس کی خلافت مسلمانوں کے لیے رحمت شمار کی جاتی ہو؟

☆ جس نے بائیس لاکھ مربع میل پر حکومت کی ہو اور اس کا عدل رہتی دنیا تک ایک مثال ہو؟

☆ جس کے جاہ وجلال کی وجہ سے زمین کانپتے ہوئے سہم گئی ہو؟

☆ جس کی دوسطری تحریر کے باعث دریائے نیل کا پانی رکنے کے بعد جاری ہو گیا ہو؟

☆ جو خلیفہ ہوتے ہوئے بھی پیوند لگے کپڑے پہن کر یہ سوچتا ہو کہ دریائے فرات کے کنارے ایک کتا بھی بھوکا مر گیا تو آخرت میں اس کا جواب مجھے دینا ہوگا؟

☆ جو امیر المؤمنین ہوتے ہوئے رات کو بھیس بدل کر مدینے کی گلیوں میں گشت کیا کرتا ہو؟

☆ جو دن کو لوگوں کی مشکلات سنتا ہو اور رات کو چھپ کر یہ مشکلات حل کیا کرتا ہو؟

☆ جو کیکر کے درخت کے نیچے تکیے کی جگہ اینٹ لگا کر سونے کو ترجیح دیتا ہو؟

☆ جو صاحبِ الہام ہو۔ جسے یہ معلوم ہو جائے کہ بکری کی ٹانگ پل پر ٹوٹ گئی ہے اور اس بات پر روتا ہو کہ اب اللہ تعالیٰ مجھ سے پوچھے گا کہ تو نے پُل ٹھیک کیوں نہ کروایا؟

☆ جو بچوں اور ان کی ماں کی خبر گیری کرنے کے بعد عورت کے سوال پر اتنا کہنے پر اکتفا کرتا ہو کہ ''جب کل تُو امیر المؤمنین سے ملے گی تو مجھے بھی وہاں پالے گی!''

☆ جو امیر المؤمنین ہوتے ہوئے بھی مسجد میں جھاڑو دیتا ہو، بیوہ عورتوں کے گھر پانی بھرنے اور ان کا سودا سلف لینے جاتا ہو، ان کے اونٹ چراتا ہو؟

☆ جو خود بیت المال کا اونٹ تلاش کرنے نکلا ہو، محض اس غرض سے کہ معلوم نہیں اس میں کتنے لوگوں کا حق ہوگا؟

☆ جس نے دس سال، چار ماہ، دس دن کی سلطنت امام عادل کی طرح نظم وضبط سے قائم کی ہو؟

☆ جو یہ کہتا ہو کہ تم لوگوں کو کیسے غلام بنا سکتے ہو جب کہ ان کی ماؤں نے ان کو آزاد جنا ہے؟

☆ جس کے بارے میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہوں کہ: ''اُس (عمر رضی اللہ عنہ) کا تذکرہ کیا کرو، کیوں کہ اس (عمر) کا تذکرہ ہوتا ہے تو عدل کا تذکرہ ہوتا ہے، جب عدل کا

تذکرہ ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا تذکرہ ہوتا ہے۔‘‘

☆ جس نے اپنے عہد میں عراق‘ شام اور مصر فتح کیا ہو؟

☆ جس کو دنیا ہی میں جنت کی بشارت مل گئی ہو؟ جس کے لیے نبی ﷺ نے خواب میں جنت کے اندر ایک خوب صورت محل بھی دیکھا ہو؟ اس کے باوجود بھی وہ نزع کے وقت یہ کہتا ہو: وَیْلِی، اِنْ لَمْ یَغْفِرِ اللّٰہُ لِیْ (میرے لیے تباہی ہے اگر اللہ نے مجھے نہ بخشا!)

☆ جس نے سب سے پہلے باقاعدہ فوج کا محکمہ قائم کیا ہو اور فوجیوں کے وظائف مقرر کیے ہوں؟

☆ جس نے اُمّ المؤمنین ؓ سے نبی اکرم ﷺ کے بائیں پہلو میں سونے (قبر) کی اجازت یہ کہہ کر طلب کی ہو کہ ’’امیر المؤمنین‘‘ کہہ کر نہ پوچھنا؟ پھر اجازت ملنے کے بعد بھی یہ کہا ہو کہ جب میری میت لے کر جاؤ تو ایک بار پھر اجازت طلب کرنا کہ پہلے شاید مجبوری میں اجازت دے دی ہو؟

☆ جس کا دورِ خلافت اسلام کا سنہری دَور کہلاتا ہو؟

اور کیا کیا کہوں کہ الفاظ ختم ہو گئے لیکن حق ادا نہ ہو سکا.........

☆ جی ہاں! یہ خلیفہ ثانی عمر بن الخطاب ؓ ہیں۔

☆ ہاں یہ عمر بن الخطاب ہیں‘ جن کی پیدائش ۵۸۶ء سے ۵۹۰ء کے درمیان کسی وقت مکہ میں ہوئی (ایک روایت کے مطابق ہجرت سے چالیس سال قبل) اور جو نبی اکرم ﷺ سے تیرہ برس چھوٹے تھے۔

☆ یہ خسر نبی ﷺ ہیں۔ (بی بی حفصہ ؓ نبی اُمّی ﷺ کے نکاح میں تھیں)

☆ یہ داماد علی ؓ ہیں.... (بی بی اُمّ کلثوم ؓ آپ ؓ کے نکاح میں تھیں)

☆ وہی عمر ؓ جن کو نبی اکرم ﷺ نے ’’فاروق‘‘ کا لقب دیا۔

☆ یہ وہ ہی فاروقِ اعظم ہیں جن کی کنیت ابو حفص ؓ تھی۔

اور اب کیا کیا سپردِ قرطاس کروں کہ قلم لرزتا ہے!

☆ جن کی وجہ سے دین اسلام کو تقویت ملی۔ نبی محترم ﷺ کے لیے جن کی جان حاضر تھی۔ جو فطرتاً سخت مزاج تھے‘ لیکن خلیفہ بن کر نرم ہو گئے تھے۔ ان کی ہیبت کفار کے دلوں

میں رچ بس گئی تھی۔

☆ عمر بن الخطاب ؓ جو سادگی واخلاق کا پیکر تھے۔

☆ وہی عمر بن الخطاب ؓ جنہوں نے ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کی جس میں انسانی ہمدردی‘ عوامی فلاح و بہبود‘ زراعت کی ترقی اور خصوصاً عدل و انصاف جیسے اصولوں کی اہمیت کو اُجاگر کیا گیا۔

☆ وہی عمر بن الخطاب ؓ جن کا نظامِ حکومت ایسی خوبیوں کا نمونہ تھا جس میں حاکم‘ امیر‘ عادل اور تمام عہدے دار لوگوں کے سامنے جواب دہ ہوں۔

☆ جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اگر اس دنیا میں ایک اور عمر پیدا ہو جاتا تو پوری دنیا پر مسلمانوں کی حکومت ہوتی۔

☆ جن کو خنجر سے ۲۷ ذی الحجہ ۲۳ ہجری میں ایسا زخمی کیا گیا کہ وہ زخموں کی تاب نہ لا سکے اور بالآخر یکم محرم الحرام ۲۴ ہجری کو جامِ شہادت نوش فرمایا۔

عمر بن الخطاب ؓ جیسا بیٹا آج تک نہ کسی ماں نے پیدا کیا‘ اور نہ ہی آئندہ پیدا ہو سکے گا۔

ابرار نیر نے کیا خوب کہا ہے:

بیانِ حق کے ہنروَر‘ ترے ہنر پہ سلام — زبانِ عدل سے پھوٹی ہوئی سحر پہ سلام
سلام ہاتھ پہ‘ کوڑا زمیں پہ مارے جو — جو آفتاب کرے ماند‘ اُس نظر پہ سلام
بہ ایں شرف بھی تو لاکھوں سے منفرد ہے عمر — مکین گنبد خضریٰ‘ ترے نگر پہ سلام
ہے اہلِ بیت مقدّس میں جس کی بیٹی بھی — رسولِ پاک ؐ کے اس محترم سسر پہ سلام
غلافِ کعبہ کا تھامے کوئی ہے محوِ دعا — درود بھیجوں دعا پڑ‘ پڑھوں ثمر پہ سلام
درِ رسول ؐ و ابوبکر ؓ پر سلام کے بعد — سلام جس کا ضروری ہے اُس عمر ؓ پہ سلام!
یہی سلام شفاعت کرے گا نیّر کی — سلام گنبدِ خضریٰ‘ نبی کے در پہ سلام!

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں ان کی سیرت سے اسلام کو سیکھنے‘ سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے‘ تاکہ ہم اسلام کے نظامِ عدل وقسط پر مبنی ایک ایسا معاشرہ قائم کر سکیں کہ دشمن ہمیں بری نگاہ سے نہ دیکھ سکے۔ آمین!

یہود و نصاریٰ کی حقیقت
قرآنِ حکیم کی روشنی میں

سعد عبد اللہ☆

حالیہ تنازع میں تقریباً آٹھ ماہ سے اسرائیل غزہ میں انسانی آبادیوں‘ ہسپتالوں‘ اسکولوں اور کیمپوں پر انتہائی وحشیانہ انداز میں بمباری کر رہا ہے۔ زیرِ حراست افراد کو قتل کرنے کے بعد ان کے جسمانی اعضاء کو چوری کر رہا ہے۔ دنیا کے مسلّمہ جنگی قوانین کی انتہائی بے شرمی سے خلاف ورزی کر رہا ہے۔ اس ننگی جارحیت پر دنیا کا نام نہاد امام امریکہ نہ صرف اسرائیل کے خلاف ہر طرح کی قرارداد کو ویٹو کر رہا ہے بلکہ اب تک اسرائیل کو اسلحہ سے بھرے سینکڑوں جہاز‘ مالی امداد اور جنگی ماہرین بھی مسلسل فراہم کر رہا ہے۔ امریکی صدر نے ہنگامی بنیادوں پر اسرائیل کو مزید اسلحے کی فروخت کی منظوری دی جس کی بنیاد پر صہیونی وزیر اعظم نیتن یاہو نے غزہ پر یک طرفہ جارحیت کئی مہینوں تک جاری رکھنے کا اعلان کیا۔

اس پس منظر میں قرآنِ حکیم کی چند آیات کا مطالعہ کرتے ہیں جن میں ربِّ کائنات نے مسلمانوں کے بدترین دشمن یہود و نصاریٰ کی حقیقت ۱۴ صدیوں پہلے ہی کھول کر واضح کر دی ہے۔

مسلمانوں کی دشمنی میں سرفہرست

﴿لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ﴾ (المائدۃ:۸۲)

’’تم ضرور بالضرور پاؤ گے لوگوں میں اہلِ ایمان کا سب سے سخت دشمن یہود کو اور مشرکین کو۔‘‘

۱۹۴۷ء سے کشمیریوں پر بھارت کے ظلم و ستم کے پہاڑ اور لاکھوں کشمیریوں کی شہادت جبکہ ۱۹۴۸ء سے فلسطینیوں پر اسرائیل کے مظالم کی داستان اس آیت کی حقانیت کے لیے کافی

☆ استاذ‘ قرآن انسٹیٹیوٹ‘ لطیف آباد‘ حیدر آباد (سندھ)

ہیں۔ کشمیریوں کی نسل کشی اور جبری انخلاء کے لیے بھارت اسرائیل سے نہ صرف تربیت لیتا ہے بلکہ اس کے مہیا کیے ہوئے ہتھیار بھی استعمال کرتا ہے۔

یہود و نصاریٰ مسلمانوں سے کبھی راضی نہیں ہوں گے

﴿وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ۭ﴾ (البقرۃ:۱۲۰)

’’اور ہرگز نہیں تم (مسلمانوں) سے راضی ہوں گے یہود و نصاریٰ یہاں تک کہ تم ان کے مذہب کی پیروی اختیار کر لو۔‘‘

اس آیت کی روشنی میں ہم دیکھتے ہیں کہ مسلم دنیا کے حکمرانوں نے یہود و نصاریٰ بالخصوص امریکہ کو خوش کرنے کے لیے ہر وہ کام کیا ہے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو ناراض کرنے والا ہے۔ تازہ ترین مثال چند عرب حکمرانوں کا اسرائیل کو باضابطہ تسلیم کرنا ہے‘ لیکن اس کے باوجود وہ ان کی خوشنودی حاصل نہ کر سکے۔

غیر یہود سے متعلق یہود کا عقیدہ

﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَاۗىِٕمًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّھُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَي اللّٰهِ الْكَذِبَ وَھُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝۷۵﴾ (آل عمران)

’’اور ان (اہلِ کتاب) میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ اگر تم ان کے پاس ایک دینار امانت کے طور پر رکھوا دو تو وہ تمہیں واپس نہیں کریں گے جب تک تم ان کے سر پر نہ کھڑے رہو۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے اوپر اُمّیین (غیر یہود) کے معاملے میں کوئی مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ اور وہ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں اور یہ سب کچھ جانتے بوجھتے کرتے ہیں۔‘‘

اس آیت کی روشنی میں ہم دیکھتے ہیں کہ یہود دنیا کی بقیہ اقوام کو Gentiles یعنی انسان نما حیوان کہتے ہیں‘ اسی لیے دنیا کی دیگر اقوام بالخصوص مسلمانوں کے ساتھ ان کا سلوک اس عقیدہ کا اظہار ہے۔ یہودی ایک دوسرے کے ساتھ سودی لین دین نہیں کرتے جبکہ پوری دنیا کو انہوں نے سود کے جال میں جکڑا ہوا ہے۔ نیز آج اسرائیل جس بہیمیت کے ساتھ ہسپتالوں‘ اسکولوں اور مہاجر کیمپوں پر بمباری کر رہا ہے اس سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ وہ دوسرے

مذاہب کے لوگوں کو انسانیت کا درجہ نہیں دیتے۔ اپنے ایک یہودی کو دشمن کی قید سے رہا کرانے کے لیے سینکڑوں فلسطینیوں کو آزاد کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

یہود و نصاریٰ کے عزائم

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِیْعُوْا فَرِیْقًا مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ یَرُدُّوْکُمْ بَعْدَ اِیْمَانِکُمْ کٰفِرِیْنَ ﴿۱۰۰﴾﴾ (آل عمران)

’’اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اگر تم اہلِ کتاب کے ایک فریق کی اطاعت کرو گے تو وہ تمہیں ایمان لانے کے بعد دوبارہ کافر بنا دیں گے۔‘‘

دنیا بھر میں عیسائی مشنریز دُنیوی ساز و سامان کا لالچ دے کر یہی فریضہ انجام دے رہی ہیں۔ دنیا کی بڑی بڑی حکومتیں انہیں بھرپور مالی معاونت فراہم کر رہی ہیں۔ نیز قادیانی فتنہ بھی انگریز کے زمانے میں اسی کی سرپرستی میں پروان چڑھا اور آج بھی یہود و نصاریٰ کی بھرپور مدد ہی سے برگ و بار لا رہا ہے۔

یہود و نصاریٰ کی حقیقت

سورۂ آلِ عمران میں اہلِ ایمان سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا:

﴿لَنْ یَّضُرُّوْکُمْ اِلَّآ اَذًی ۭ وَاِنْ یُّقَاتِلُوْکُمْ یُوَلُّوْکُمُ الْاَدْبَارَ ۣ ثُمَّ لَا یُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ ضُرِبَتْ عَلَیْہِمُ الذِّلَّۃُ اَیْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰہِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَاۗءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَضُرِبَتْ عَلَیْہِمُ الْمَسْکَنَۃُ ۭ ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ کَانُوْا یَکْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَیَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِیَاۗءَ بِغَیْرِ حَقٍّ ۭ ذٰلِکَ بِمَا عَصَوْا وَّکَانُوْا یَعْتَدُوْنَ ﴿۱۱۲﴾﴾ (آل عمران)

’’وہ (یہود و نصاریٰ) تمہیں ہرگز کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے سوائے ستانے کے۔ اور اگر وہ تم سے جنگ کریں گے تو پیٹھ دکھا کر بھاگیں گے‘ پھر ان کو مدد بھی نہیں ملے گی۔ ان کے اوپر ذلت مسلط کر دی گئی ہے جہاں بھی یہ پائے جائیں سوائے اس کے کہ وہ اللہ کی پناہ میں آ جائیں یا انسانوں کی‘ اور وہ اللہ کے غضب میں گرفتار ہیں اور محتاجی ان پر مسلط کر دی گئی ہے۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے اور انبیاء کو ناحق قتل کر دیتے تھے۔ اور اس لیے کہ وہ نافرمان اور سرکش تھے۔‘‘

یہود کی پوری تاریخ اس بزدلی سے بھری ہوئی ہے جو مندرجہ بالا آیات میں بیان کی گئی ہے۔ یہودی بنیادی طور پر ایک بزدل قوم ہے اور یہ بزدلی ان میں دنیا پرستی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ حالیہ جنگ میں اسرائیل نے پہلے کئی دنوں تک ہر ممکن کوشش کی کہ فضا سے اتنے بم برسائے جائیں کہ جب ان کی افواج زمینی آپریشن کے لیے داخل ہوں تو کم سے کم مزاحمت ہو اور دوبدو جنگ کی نوبت ہی نہ آئے۔

یہود و نصاریٰ کے دلوں میں بغض

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَۃً مِّنْ دُوْنِکُمْ لَا یَاْلُوْنَکُمْ خَبَالًا ۭ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاۗءُ مِنْ اَفْوَاھِھِمْ ۚ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُھُمْ اَکْبَرُ ۭ قَدْ بَیَّنَّا لَکُمُ الْاٰیٰتِ اِنْ کُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾﴾ (آل عمران)

’’اے لوگو جو ایمان لائے ہو! کسی غیر کو اپنا راز دار نہ بنانا‘ یہ لوگ تمہاری خرابی (فتنہ انگیزی) میں کسی طرح کی کوتاہی نہیں کرتے اور چاہتے ہیں کہ تمہیں تکلیف پہنچے۔ ان کی زبانوں سے تو دشمنی ظاہر ہو ہی چکی ہے اور جو کچھ (کینے) ان کے سینوں میں پوشیدہ ہیں وہ کہیں زیادہ ہیں۔ اگر تم عقل رکھتے ہو تو ہم نے تم کو اپنی آیتیں کھول کھول کر سنا دی ہیں۔‘‘

﴿وَاِذَا لَقُوْکُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَیْکُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَیْظِ ۭ قُلْ مُوْتُوْا بِغَیْظِکُمْ ۭ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۱۹﴾﴾

’’اور جب وہ تم سے ملتے ہیں کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے‘ اور جب تنہائی میں ہوتے ہیں تو تم پر اپنی انگلیاں کاٹتے ہیں غصے کے سبب۔ کہہ دیجیے کہ تم اپنے غصے میں مر جاؤ۔ بیشک اللہ تعالیٰ سینوں کے رازوں کو خوب جاننے والا ہے۔‘‘

ان آیات سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ یہود و نصاریٰ کے سینے مسلمانوں کی نفرت سے لبریز ہیں۔ گزشتہ چند سالوں میں افغانستان اور عراق میں لاکھوں مسلمانوں کو جھوٹا بہانہ بنا کر شہید کر دیا گیا۔ مشرقِ وسطیٰ بالخصوص شام میں اسرائیل کی در پردہ سازشوں اور امریکہ کی کھلی مداخلت سے لاکھوں بے گناہ مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور اب فلسطین میں امریکی اسلحے کی مدد سے اسرائیل ہزاروں بے گناہ مسلمانوں کو انتہائی بے دردی سے شہید کر چکا ہے۔ (باقی صفحہ 71 پر)

فریضۂ اقامتِ دین اور میرا گھر

عبدالرؤف ☆

تنظیم اسلامی کا قیام غلبہ واقامتِ دین کے لیے عمل میں لایا گیا ہے۔ اس کا رفیق ہونے کے ناطے میرے سامنے کچھ حقائق واضح رہنے چاہئیں۔ پہلے یہ کہ میں جس اجتماعیت کا حصّہ ہوں وہ معروف معنیٰ میں کوئی سیاسی جماعت نہیں ہے جس کے پیشِ نظر انتخابی سیاست میں حصّہ لے کر اس نظام کے اندر رہتے ہوئے صرف چہروں کی تبدیلی مقصود ہو۔ دوسرے یہ کوئی مذہبی فرقہ‘ مسلک یا گروہ بھی نہیں ہے جو چند فروعی معاملات میں اُلجھ کر رہ جاتا ہے‘ اپنے مسلک کو کُل دین سمجھ بیٹھتا ہے اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر دوسرے گروہوں پر کفر کے فتوے لگاتا رہتا ہے۔ درحقیقت یہ اجتماعیت اس لیے وجود میں آئی ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے عطا کردہ نظامِ عدلِ اجتماعی کو غالب کرنے کی جِدّوجُہد سب سے پہلے پاکستان میں اور بعد ازاں کل روئے ارضی پر کرتے ہوئے بالآخر اللہ کے حضور پیش ہوجائے۔ صرف اسی طرح اُس رضائے الٰہی کا حصول ممکن ہو سکے گا جو ایک مسلمان کا اصل نصب العین ہے۔

رفیقِ تنظیم ہونے کے ناطے جب میرے سامنے فریضۂ اقامتِ دین کی اہمیت واضح ہوتی ہے تو میں سب سے پہلے اس مسئلہ سے دوچار ہوتا ہوں کہ ہمارے معاشرے کی اکثریت کا تصوّرِ دین نہ صرف محدود بلکہ مسخ شدہ بھی ہے۔ نماز‘ روزہ اور چند دیگر انفرادی اعمال ہی کو اصل دین سمجھا جارہا ہے۔ ایسے میں لازم ہے کہ اس انقلابی نظریہ کے ساتھ میری وابستگی دل وجان کے ساتھ ہو۔ اس کے بعد رفقاءِ تنظیم کے دس مطلوبہ اوصاف پورے شعور‘ گہرائی اور گیرائی کے ساتھ میرے اندر پیدا ہو کر میری عملی زندگی کا مستقل حصہ بن جائیں۔ تب ہی نہ صرف مَیں دین میں پیش قدمی کر سکوں گا بلکہ پوری اجتماعیت بھی تیزی کے ساتھ آگے سفر کر رہی ہوگی۔ بصورت دیگر‘ نہ تو میں اپنے گھر کی اصلاح کر سکوں گا اور نہ ہی اپنے ماحول کو بدل سکوں گا۔

☆ معاون‘ شعبہ تعلیم وتربیت‘ تنظیم اسلامی

میرے کام کرنے کا اگلا میدان یا اگلا دائرہ میرا گھر ہے جہاں میری حیثیت ایک بیٹے‘ بھائی‘ شوہر یا باپ کی ہے۔ اگر اقامتِ دین کی فرضیت پر میرا دل ٹُھک گیا ہے اور مجھے شعوری ایمان بھی حاصل ہونا شروع ہوگیا ہے تو پھر میں اپنے گھر میں چین سے نہ بیٹھ سکوں گا۔ اپنے والدین‘ بہن بھائی‘ بیوی اور اولاد سے میری محبت کا تقاضا یہی ہوگا کہ انہیں جہنم کی آگ سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کروں۔ مَیں جس تحریک کا حصہ ہوں‘ اس کے پیشِ نظر انفرادی نصب العین یہی ہے کہ نجاتِ اُخروی اور رضائے الٰہی حاصل ہوجائے۔ اس کا طریقہ یہی ہے کہ اس دنیا میں رہتے ہوئے غلبۂ دین کی جِدّوجُہد کو زندگی کا مقصد بنا لیا جائے۔

بطور ایک رفیقِ تنظیم‘ یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ اپنے اہلِ خانہ کا تعلق اللہ تعالیٰ سے جوڑنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کا تعلق قرآن کے ساتھ جوڑ دیا جائے۔ انہیں حدیث اور سُنّت کی عملی تعلیم دی جائے۔ عبادات‘ معاملات اور بنیادی اخلاقیات کا نہ صرف واضح شعور دیا جائے بلکہ یہ سب کچھ ان کی عملی زندگی کا ایک حصہ بن جائے۔

ہمارے معاشرے میں دین کے ساتھ عملی تعلق کا تصور نہایت محدود ہے۔ زیادہ تر افراد صرف نماز‘ روزہ کی پابندی یا چند بنیادی اخلاقیات پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک قلیل تعداد ایسی بھی ہوتی ہے جو شرعی پردہ‘ فوتگی وشادی کی رسومات سُنّت کے مطابق ادا کرنے کے علاوہ سود‘ فحاشی اور بے حیائی سے بھی بچنے کی کوشش کرتی ہے۔ تاہم ان تمام امور پر عمل پیرا ہونے اور اہلِ خانہ کی اس انداز سے تربیت کرنے کے باوجود اُن کا تصورِ اقامتِ دین واضح نہیں ہوتا۔ وہ اسی نظام کے تحت نہ صرف زندگی گزارتے رہتے ہیں بلکہ اپنے کاروبار‘ ملازمت اور دیگر معاشی معاملات میں آگے بڑھنے کی بھی پوری جِدّوجُہد کرتے رہتے ہیں۔ اپنا معیارِ زندگی بھی بڑھانے کی تگ ودو میں رہتے ہیں۔

ایسے مذہبی طبقات کا عملی رویہ سامنے رکھتے ہوئے جب ہم اپنے رفقاء کا ذاتی اور گھریلو سطح پر جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں درج ذیل مثبت پہلو نظر آتے ہیں:

(۱) نمازِ باجماعت اور سُنّت ونوافل کی ادائیگی

(۲) قرآن حکیم کی تلاوت کے ساتھ ترجمہ وتفسیر

(۳) مسنون دعائیں اور اذکارِ مسنونہ کا حفظ اور اہتمام

(۴) گھر میں شرعی پردہ کا نفاذ

(۵) غیر شرعی رسومات میں شرکت سے اجتناب

(۶) ٹی وی، کیبل اور انٹرنیٹ کے غلط استعمال سے پرہیز

(۷) حلال پر مبنی ذرائع آمدنی اختیار کرنا اور سود، رشوت وغیرہ سے بچنا

(۸) ہر طرح کی فحاشی اور بے حیائی سے بچنے کی کوشش

(۹) جھوٹ، غیبت، حسد، بغض، کینہ سمیت تمام باطنی بیماریوں سے بچنے کا شعوری احساس

(۱۰) ہمسایوں، رشتہ داروں اور احباب کے ساتھ بہترین اخلاقی رویّہ

اکثر رفقاءِ تنظیم میں اس کے علاوہ بھی دینی اعتبار سے بہت سی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ اقامتِ دین کی جدّوجُہد کرنے والی جماعت کے متعلقین میں ان اوصاف کا پایا جانا انتہائی ضروری بھی ہے۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مذہبی جذبہ رکھنے والے بعض لوگوں میں مندرجہ بالا اوصاف ہمارے رفقاء سے بھی بڑھ کر پائے جاتے ہیں اور بعض مذہبی جماعتوں کے ارکان انفاقِ مال اور دعوت و تبلیغ کے لیے وقت فارغ کرنے کے معاملے میں ہم سے بہت آگے ہیں، لیکن تنظیم اسلامی کے رفقاء اس اعتبار سے بالکل منفرد نظر آتے ہیں کہ ان کے سامنے دین کا ایک ہمہ گیر تصور، فرائضِ دینی کا جامع تصور، منہجِ انقلابِ نبوی ﷺ، نظمِ جماعت اور بیعتِ سمع و طاعت پر مبنی مربوط دینی فکر ہے۔ ان پر اچھی طرح واضح ہے کہ اقامتِ دین کی جدّوجُہد فرضِ عین ہے اور اس کے لیے التزامِ جماعت لازم ہے۔ عام لوگوں کے سامنے ان میں سے کوئی پہلو بھی واضح نہیں۔ اگر وہ کسی جماعت، مسلک یا فرقہ سے منسلک ہیں بھی تو دین کا ہمہ گیر تصور ان کے سامنے بھی موجود نہیں۔

اہلِ خانہ کی تربیت میں اوپر بیان کیے گئے دینی امور میں آگے بڑھنے کی ضرورت نہایت اہم ہے۔ لہٰذا ان کا جائزہ احتسابی یادداشت، ششماہی رپورٹ، ماہانہ اور سہ ماہی طلب اصلاح خطوط کے ذریعہ بھی لیا جا رہا ہے اور ''احسانِ اسلام کے تقاضے'' والے سرکلر میں بھی اس حوالے سے رفقاء کو یاددہانی کرائی جا رہی ہے۔ اس کے خاطر خواہ اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ کچھ رفقاء باقاعدگی کے ساتھ گھریلو اُسرہ کا انعقاد بھی کر رہے ہیں۔ بہت سے رفقاء ایسے بھی ہیں جو اپنے

بچوں کو قرآن کریم حفظ کروا رہے ہیں اور کلیۃ القرآن یا دیگر دینی مدارس سے درسِ نظامی کے کورسز بھی کروا رہے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں رفقاء کے گھروں میں اگرچہ کافی حد تک تبدیلی آ رہی ہے لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ بالعموم یہ اسی نوعیت کی تبدیلی ہے جو دیگر مذہبی فکر رکھنے والے افراد اور گھرانوں میں آ رہی ہے۔ ہماری اکثریت بھی بے فکر ہو کر اسی نظامِ باطل کی چھتری تلے دین کے ایک محدود تصور کے تحت زندگی گزار رہی ہے۔

ایک رفیقِ تنظیم کے لیے بہت ضروری ہے کہ فریضۂ اقامتِ دین کی اہمیت کو خود بھی سمجھے اور اپنے اہلِ خانہ کو بھی اس کا شعور دے۔ خصوصاً بالغ بچوں کے اذہان میں اس دینی فکر کو اپنی اصل روح کے ساتھ منتقل کرنے کی حتی الامکان کوشش کرتا رہے۔ یہ تب ہی ممکن ہے جب اُن کے سامنے تکرار و اعادہ سے اقامت دین کی فرضیت اور اہمیت مسلسل بیان کی جائے۔ اس حوالے سے ۲۰۲۲ء میں ندائے خلافت کے شمارہ ۴۷ کے سرورق پر حکیم سید محمود احمدؒ کی تحریر کا ایک اقتباس دیا گیا ہے جس میں یہ بات بیان ہوئی ہے کہ:

''ہمیں کتابِ الٰہی کی روشنی میں اور سُنّتِ رسالت پناہ ﷺ کی راہنمائی میں اپنا جائزہ لینا ہے۔ خود متحرک ہونا ہے تاکہ حرکت ہمارے وجود میں پیدا ہو اور پھر یہی تموّج ہمارے گھر کی فضاؤں میں آئے، ہمارے افرادِ خانہ کے کردار میں ابھرے۔ ہمارے گھر نمونے کے گھر بنیں اور ہمارے اہلِ خانہ زبان سے دعوت نہ بھی دیں تو اُن کا طرزِ عمل آس پاس کے ماحول میں اسی طرح کی تبدیلی پیدا کردے جس کے بارے میں سید مودودیؒ نے کہا تھا کہ فریضۂ اقامتِ دین کو سمجھنے والا آدمی جس ماحول میں رہتا ہو وہاں اُس کی طرف لوگوں کی نگاہیں بھی اُٹھنی چاہئیں کہ یہ ہے وہ جو خود تبدیل ہو گیا ہے اور اس کی طرف لوگوں کی انگلیاں بھی اُٹھنی چاہئیں کہ یہ ہے وہ جو تبدیلی بھی لے آئے گا۔''

اپنے اہل و عیال پر اقامتِ دین کے فریضہ کی اہمیت واضح کرنے سے درج ذیل مفید نتائج ضرور برآمد ہوں گے، ان شاء اللہ۔

(i) اکثر رفقاء کا کہنا ہے کہ دینی و تنظیمی امور کے لیے گھر سے باہر رہنے کے نتیجہ میں بیوی اور بچوں کی طرف سے شکایت رہتی ہے کہ آپ ہمیں وقت ہی نہیں دیتے۔ دراصل چونکہ اہلِ خانہ دین کے کام کو بھی باقی امور کی طرح ایک معمول کا کام سمجھتے ہیں اور اس کی اہمیت اُن پر پوری طرح واضح نہیں ہوتی اس لیے وہ یہ شکایت کرتے ہیں۔ جب ان کے

سامنے اقامتِ دین کے فریضہ کی اہمیت موجودہ حالات کے تناظر میں واضح ہو جائے گی تو اُن کی یہ شکایت بھی خود بخود ختم ہو جائے گی اور بجائے مزاحمت کے اُن کی طرف سے موافقت اور تعاون والا رویہ سامنے آئے گا۔

(ii) ایک اور بڑا مسئلہ دنیاوی کیریئر (career) اور سہولیات کے حصول کا ہے۔ جب اہل وعیال دیکھتے ہیں کہ کسی اور جماعت یا تحریک سے تعلق رکھنے والے لوگ تو دنیا کے معاملے میں بھی آگے بڑھ رہے ہیں اور اُن کے کاروبار اور جائیداد میں بھی اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے جبکہ ہمارا معیارِ زندگی ایک حد سے آگے نہیں بڑھ رہا تو وہ تذبذب کا شکار ہو جاتے ہیں کہ وہ درست راستے پر ہیں یا ہم! جب اُن کے سامنے یہ واضح ہو جائے گا کہ یہ سارا نظام حرام پر مبنی ہے اور اس سے کم سے کم استفادہ کر کے جو توانائی بچے اُسے نظام کی تبدیلی کے لیے لگانا ہے تب اُن کی طرف سے بھی ہمیں پورا تعاون حاصل ہوگا۔ وہ دوسرے لوگوں یا عزیز واقارب کے بلند معیارِ زندگی سے متاثر نہیں ہوں گے بلکہ رہن سہن کے ادنیٰ درجہ کے معیار پر راضی ہو جائیں گے۔ یوں اقامتِ دین کی جِدّوجُہد سے مزید محبت پیدا ہوتی چلی جائے گی۔

(iii) نبوی منہج کے مطابق غلبۂ دین کی جِدّوجُہد والا راستہ مشکلات اور مصائب والا ہے۔ اگر اہل وعیال کی مناسب تربیت ہوتی رہے تو وہ ان تکالیف‘ مصائب اور نقصانات سے نہیں گھبرائیں گے۔ اگر فاسد نظام کے علم برداروں کی طرف سے قید وبند‘ جلاوطنی‘ ضبطِ اموال وجائیداد جیسے مسائل پیش آئیں گے تو وہ ثابت قدمی دکھا سکیں گے اور نامساعد حالات میں بھی ہمارا پوری طرح ساتھ دیں گے۔

(iv) اکثر رفقاء یہ سوال بھی بار بار کرتے ہیں کہ ہم اقدام کے مرحلہ تک کب پہنچیں گے! اس کا جواب بھی یہی ہے کہ جب فریضۂ اقامتِ دین کی اہمیت واضح ہونے پر ہمارے اہل وعیال بھی اس مشن میں پوری طرح فعال ہوں گے تو اقدام کا مرحلہ بھی تیزی کے ساتھ قریب آتا چلا جائے گا۔ مثال کے طور پر اگر آج رفقاءِ تنظیم کی تعداد دس ہزار ہے اور ہر رفیق کے بالغ اہلِ خانہ کی تعداد اوسطاً پانچ ہے تو اس انداز سے کی گئی محنت کے نتیجہ میں بہت جلد پچاس ہزار کا ہدف پورا ہو جائے گا۔ جب یہ پچاس ہزار افراد (مرد وخواتین)

’’الاقرب فالاقرب‘‘ کی روح کے ساتھ اپنے حلقۂ احباب تک دین کا انقلابی فکر پہنچانے کے لیے اپنی جان‘ مال اور اوقات کو فارغ کر لیں گے تو انقلاب کی منزل قریب آتی چلی جائے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ!

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ سورۃ التغابن کی آیت ۱۶ کے درس میں ایک مؤمن کا اپنی اولاد کے بارے میں طرزِ عمل یوں بیان فرماتے ہیں:

> ’’کسی شخص کی اندرونی شخصیت دیکھنی ہو تو اُس کی اولاد کو دیکھیں۔ جو اُس کی اصل اقدار (values) ہیں وہ اُس کی اولاد میں ضرور منعکس (reflect) ہوتی ہیں۔ (یہ تو ہو سکتا ہے کہ نبیوں کی اولاد بھی گمراہ ہو جائے جس طرح حضرت نوح علیہ السلام کا بھی ایک بیٹا کافر تھا) پس ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ ہماری جِدّوجُہد کی سمت کس طرف ہے! ہم اپنی اولاد کو کیا بنانے کی فکر کر رہے ہیں؟ اسی سے ہماری جِدّوجُہد کا عکس منعکس (reflect) ہوگا کہ ہماری اپنی قدر (value) کیا ہے! ہم خود تو کسی مذہبی مسند پر بیٹھے ہوئے ہیں لیکن اپنی اولاد کی کیسے تربیت کر رہے ہیں؟ ان کے مستقبل کے حوالے سے ہمارا نقطۂ نظر کیا ہے؟‘‘

بانی محترمؒ کے درج بالا الفاظ کی روشنی میں رفقاءِ تنظیم نے خود اپنا جائزہ لینا ہے کہ ہم اپنی اولاد کی دینی تربیت کے حوالے سے کس مقام پر کھڑے ہیں۔ چونکہ اپنے مقام ومرتبہ کے اعتبار سے جواب دہی بھی سخت ہوگی لہٰذا ذمہ دارانِ تنظیم کو تو اس پہلو سے زیادہ آگے بڑھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس ضمن میں یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ میرے اوپر صرف کوشش فرض ہے۔ اگر پوری کوشش کے باوجود تبدیلی نہیں آتی تو قرآن میں بیان کی گئی تین مثالیں واضح رہنی چاہئیں:

(i) حضرت ابرٰہیم علیہ السلام کے والد کی

(ii) حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے اور بیوی کی

(iii) حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی کی

ان مثالوں میں ہمارے لیے یہی رہنمائی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے کسی کے لیے ہدایت کا فیصلہ نہیں کیا تو پیغمبر بھی اپنی پوری کوشش کے باوجود انہیں سیدھے راستے پر نہیں لا سکتے۔ لہٰذا ہمارے لیے اصلاً کوشش فرض ہے اور اسی کا ہم سے سوال بھی کیا جائے گا۔ جس کی ذمہ داری یا عہدہ جتنا بڑا ہوگا اُس سے باز پُرس بھی اتنی ہی زیادہ سخت ہوگی۔

ایک مبتدی رفیق کا دائرہ محدود ہے‘ جبکہ ایک ملتزم رفیق کا دائرہ بڑا ہو جاتا ہے۔ اسی

طرح ایک نقیبِ اُسرہ کی ذمہ داری میں مزید اضافہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد مقامی امیر‘ امیر حلقہ اور دیگر ذمہ داران کی مسئولیت میں ان کے مقام و مرتبہ کے تناسب سے اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ لہٰذا ’’جن کے رتبے ہیں سوا اُن کی سوا مشکل ہے‘‘ والا معاملہ بن جاتا ہے۔ تنظیم کے نظم میں جو جتنی بڑی ذمہ داری پر فائز ہوگا‘ اپنے اہل و عیال کی دینی تربیت کے حوالے سے اس کی ذمہ داری بھی اتنی ہی زیادہ ہوگی‘ کیونکہ ہر ذمہ دار اپنے زیریں نظم رفقاء کے لیے نمونہ ہوتا ہے۔ اگر ان کے اہلِ خانہ کا تنظیم کے ساتھ علمی‘ فکری اور عملی تعلق گہرا ہوگا تو یہ امر نہ صرف ان کی اپنی اُخروی فلاح کا باعث بنے گا بلکہ دوسرے رفقاء کے لیے بھی اس میں ایک بہترین نمونہ ہوگا‘ جو اس سے رہنمائی حاصل کر کے دین میں آگے بڑھنے کی کوشش کریں گے۔ یہ ایک ایسی کوشش ہے جس میں کامیابی کا ان الفاظ میں پکا وعدہ ہے کہ:

﴿وَالَّذِیۡنَ جَاہَدُوۡا فِیۡنَا لَنَہۡدِیَنَّہُمۡ سُبُلَنَا ؕ وَ اِنَّ اللّٰہَ لَمَعَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۶۹﴾﴾

(العنکبوت)

’’اور جنہوں نے ہماری راہ میں کوشش کی‘ ضرور ہم انہیں اپنے راستے دکھا دیں گے۔ اور بے شک اللہ نیکوکاروں کے ساتھ ہے۔‘‘ ❁❁❁

بقیہ: یہود و نصاریٰ کی حقیقت

مسلمانوں سے حسد

﴿اِنۡ تَمۡسَسۡکُمۡ حَسَنَۃٌ تَسُؤۡہُمۡ ۫ وَ اِنۡ تُصِبۡکُمۡ سَیِّئَۃٌ یَّفۡرَحُوۡا بِہَا ؕ وَ اِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَ تَتَّقُوۡا لَا یَضُرُّکُمۡ کَیۡدُہُمۡ شَیۡئًا ؕ اِنَّ اللّٰہَ بِمَا یَعۡمَلُوۡنَ مُحِیۡطٌ ﴿۱۲۰﴾﴾

(آلِ عمران)

’’(مسلمانو!) اگر تمہیں کوئی بھلائی پہنچے تو وہ انہیں بری لگتی ہے‘ اور اگر تمہیں کوئی تکلیف پہنچے تو وہ اس پر خوش ہوتے ہیں۔‘‘

اس آیت کی روشنی میں اگر ہم پاکستان کا جائزہ لیں تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ جب سے یہ ملک وجود میں آیا ہے امریکہ اور اس کے حواریوں نے اسے مستحکم نہیں ہونے دیا۔ کٹھ پتلی حکمرانوں کے ذریعے اسے اپنے شکنجے میں کس لیا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج وطن عزیز ہر لحاظ سے انتہائی دگرگوں حالت میں ہے۔ ❁❁❁

خدمتِ خلق

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

اللہ واحد خالق ہے‘ باقی ہر شے اس کی مخلوق ہے۔ اُس کی مخلوق اَن گنت ہے۔ زمین‘ آسمان‘ سورج‘ چاند‘ ستارے اور دیگر اجرامِ فلکی اُسی نے پیدا کیے ہیں۔ اس کے علاوہ جمادات‘ نباتات اور جان دار اُس کی مخلوق ہیں۔ جان دار مخلوق میں پرندے‘ چرندے‘ درندے بھی ہیں اور ایسے جانور بھی ہیں جو بہت چھوٹے ہیں اور انسانی آنکھ سے نظر بھی نہیں آتے جبکہ کچھ بڑے بڑے ہیں۔ کچھ ایسے کیڑے مکوڑے ہیں کہ وہ صرف محدث عدسے کے ذریعے ہی دیکھے جا سکتے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو پھر بھی نہیں دیکھے جا سکتے۔ مخلوقات میں سے ہر مخلوق بامقصد ہے‘ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی کام بھی عبث نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ہم اس کی حکمت نہیں جانتے۔

حدیث میں آیا ہے: ((اَلْخَلْقُ عَیَالُ اللّٰہِ)) یعنی مخلوق کے افراد اللہ تعالیٰ کا کنبہ ہیں۔ جس طرح ہر شخص کو اپنے کنبے سے پیار ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کو بھی اپنی مخلوق سے محبت ہے۔ اکثر جان دار مخلوق انسان کو فائدہ پہنچاتی ہے لہٰذا ان کو دُکھ دینا اچھا نہیں۔ کسی جان دار کو مارنا پیٹنا تو دور کی بات ہے‘ بلاضرورت درخت کاٹنے کی بھی اجازت نہیں۔ کچھ جانور ایسے ہیں جو موذی اور نقصان دہ ہیں‘ ان کا مفاد ہم پر واضح نہیں۔ کسی خطرے کے پیش نظر انہیں ہلاک کرنے کا حکم ہے مگر ظالمانہ طریقے سے دکھ دے کر مارنا گناہ ہے۔ اسلامی احکام میں ایسا کوئی حکم نہیں جو فائدے سے خالی ہو۔ غرض جو بھی مخلوق ہے‘ کسی نہ کسی طرح فائدے کی حامل ہے جو اکثر و بیشتر لوگوں سے مخفی ہوتا ہے۔ جو جانور انسان کی خوراک کے لیے ہیں مثلاً مرغ‘ بھیڑ‘ بکری‘ گائے‘ وغیرہ تو انہیں بھی ذبح کرتے وقت چھری کو پہلے سے تیز رکھنے کا حکم ہے‘ تاکہ انہیں زیادہ تکلیف نہ ہو۔ ذبح کرنے سے پہلے جانور کو پانی پلانے کا حکم ہے۔ بعض مفید جانوروں کو گھر میں پالا جاتا ہے۔ ایسے جانوروں کو پیٹ بھر کر کھانا کھلایا جائے اور مناسب کام لیا جائے تاکہ

ان کو تکلیف نہ ہو۔ بیماری کی صورت میں ان کا علاج کیا جائے۔

مخلوقات میں اشرف مخلوق انسان ہے جسے عقل وشعور اور فہم وفراست سے نوازا گیا ہے۔ اُس پر لازم کیا گیا ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کے ساتھ محبت کرے۔ ضرورت کے وقت ان کی مدد کرے اور ہمہ وقت ان کا ہمدرد ہو۔ انسان مل جل کر رہتے ہیں‘ ضروری ہے کہ ان کے آپس کے تعلقات خوش گوار ہوں۔ ہمسائے کے ساتھ قریب ترین تعلق ہوتا ہے اس لیے حکم ہے کہ اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔ یہ حکم اتنا اہم ہے کہ اس کی خلاف ورزی پر عاقبت میں سزا کی وعید سنائی گئی ہے۔

بخاری ومسلم کی ایک حدیث کے مطابق ایک بے درد اور بے رحم عورت اس لیے جہنم میں گرائی گئی کہ اس نے ایک بلی کو باندھ کر بھوکا مار ڈالا۔ نہ تو اسے خود کچھ کھانے کو دیا اور نہ اسے چھوڑا کہ وہ زمین کے کیڑے مکوڑوں سے اپنی غذا حاصل کر لیتی۔ جب کسی جانور کے ساتھ ظلم کرنا اور اسے مار دینا ایک بڑا جرم قرار پایا تو بنی نوعِ انسان کے کسی فرد یا اپنے مسلمان بھائی کے ساتھ برا سلوک کرنے والا اللہ تعالیٰ کے ہاں کیسا بدلہ پائے گا! ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے۔ جب ایک جانور کو بھوکا مارنے کی سزا جہنم ہے تو دوسروں کی تکلیف دور کرنا کتنی بڑی نیکی ہوگی۔ حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس اثنا میں کہ ایک آدمی راستہ چلا جا رہا تھا‘ اسے سخت پیاس لگی‘ چلتے چلتے اُسے ایک کنواں ملا‘ وہ اس کے اندر اترا اور پانی پی کر باہر نکل آیا۔ اُس نے دیکھا کہ ایک کتا ہے جس کی زبان باہر نکلی ہوئی ہے اور پیاس کی شدت سے وہ کیچڑ کھا رہا ہے۔ اس آدمی نے دل میں کہا کہ اس کتے کو بھی پیاس کی ایسی ہی تکلیف ہے جیسی کہ مجھے تھی‘ چنانچہ وہ اس کتے پر رحم کھا کر پھر اس کنویں میں اترا اور اپنے چمڑے کے موزے میں پانی بھر کر اُس کو اپنے منہ سے تھاما‘ اور کنویں سے باہر نکل کر اُس کتے کو وہ پانی پلا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی اس رحم دلی اور اس محنت کی قدر فرمائی اور اسی عمل پر اس کی بخشش کا فیصلہ فرما دیا۔ بعض صحابہؓ نے حضور ﷺ سے یہ واقعہ سن کر دریافت کیا کہ یارسول اللہ! کیا جانوروں کی تکلیف دور کرنے میں بھی ہمارے لیے اجر وثواب ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ((نَعَمْ، فِي كُلِّ ذَاتِ كَبِدٍ رَطْبَةٍ أَجْرٌ)) ’’ہاں! ہر زندہ اور تر جگر رکھنے والے جانور (کی تکلیف دور کرنے) میں ثواب ہے۔‘‘ (بخاری ومسلم)

عبداللہ بن جعفر ؓ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ ایک انصاری صحابی کے باغ میں تشریف لے گئے‘ وہاں ایک اونٹ تھا۔ جب اُس اونٹ نے آپ کو دیکھا تو ایسا ڈکرایا اور ایسی درد بھری آواز نکالی جیسی بچے کے جدا ہونے پر اونٹنی کی آواز نکلتی ہے‘ اور اُس کی آنکھوں سے آنسو بھی جاری ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ اُس کے قریب تشریف لے گئے‘ اور آپ نے اس کی کنوتیوں پر اپنا دستِ شفقت پھیرا (جیسے کہ گھوڑے یا اونٹ پر پیار کرتے وقت ہاتھ پھیرا جاتا ہے) وہ اونٹ خاموش ہو گیا۔ پھر آپ ﷺ نے دریافت فرمایا کہ یہ اونٹ کس کا ہے؟ اِس کا مالک کون ہے؟ ایک انصاری نوجوان آئے‘ اور انہوں نے عرض کیا: حضرت! یہ اونٹ میرا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اس بیچارے بے زبان جانور کے بارے میں تم اس اللہ سے ڈرتے نہیں جس نے تم کو اس کا مالک بنایا ہے؟ اِس نے مجھے شکایت کی ہے کہ تم اس کو بھوکا رکھتے ہو اور زیادہ کام لے کر تم اس کو بہت دکھ پہنچاتے ہو۔‘‘ (سنن ابی داوٗد)

اللہ تعالیٰ نے ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کا بھائی بتایا ہے‘ لہٰذا اپنے بھائی کی تکلیف کا احساس کرنا ضروری ہے۔ اب حالت یہ ہے کہ قتل کرنے کو بھی گناہ نہیں سمجھا جاتا‘ حالانکہ جان اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے۔ خودکشی اسی لیے حرام ہے کہ کسی شخص کو اجازت نہیں کہ وہ خالق کی دی ہوئی امانت میں خیانت کرے۔ ایسا کرنا عذاب کا باعث ہے۔ ایسے میں اگر کوئی مسلمان اپنے مسلمان بھائی کو قتل کر دے تو اس جرم کی سنگینی کیسی ہوگی! قرآن مجید میں وعید ہے:

﴿وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ۝۹۳﴾ (النساء)

’’جو شخص کسی مسلمان کو عمداً مار ڈالے تو اس کی سزا دوزخ ہے جس میں وہ ہمیشہ جلتا رہے گا اور اللہ اس پر غضب ناک ہوگا اور اس پر لعنت کرے گا اور ایسے شخص کے لیے اس نے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔‘‘

قتل تو بہت بڑا گناہ ہے۔ کسی کو معمولی سی تکلیف دینا بھی جہنم کا باعث ہو سکتا ہے۔ اس کے برعکس دوسروں پر رحم کرنا اور انہیں تکلیف سے بچانا اللہ تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ اور اجر عظیم کا باعث ہے۔ راستے سے پتھر ہٹانا بھی ایک بڑی نیکی ہے‘ کیونکہ وہ وہاں سے گزرنے والوں کے لیے تکلیف کا باعث بن سکتا ہے۔

جو آدمی اللہ کی مخلوق کے ساتھ نیک سلوک کرتا ہے‘ اللہ تعالیٰ اس پر رحمت کرتا ہے جبکہ برا سلوک کرنے اور نقصان پہنچانے والے کو ناپسند کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((مَنْ لَا یَرْحَمْ لَا یُرْحَمْ)) (متفق علیہ) یعنی جو شخص لوگوں پر رحم نہیں کرتا اللہ تعالیٰ بھی اس پر رحم نہیں کرتا۔ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم رہیں گے جن کے دل میں دوسرے آدمیوں کے لیے رحم نہیں اور جو دوسروں پر ترس نہیں کھاتے۔ آدم کا بیٹا چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا‘ مسلم ہو یا کافر اس کی تکلیف اور پریشانی دور کرنا اور حسبِ استطاعت اس کی مدد کرنا دوسروں کا فرض ہے۔ اسی جذبے کا نام دردِ دل ہے اور یہ پسندیدہ ہے۔ بقول خواجہ میر درد: ؎

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں

اسی مضمون کی ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”رحم کرنے والوں اور ترس کھانے والوں پر بڑی رحمت والا خدا رحم کرے گا۔ زمین پر رہنے بسنے والی اللہ کی مخلوق پر تم رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔“ (جامع ترمذی) صرف انسان ہی نہیں بلکہ حیوان‘ چرند‘ پرند جو بھی تکلیف میں ہو اس کی مدد کرنے کا حکم ہے۔

کسی بھی پالتو یا بار برداری کے جانور کے مالک کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کی ضرورت کا خیال رکھے۔ اسے وقت پر چارا‘ پانی اور خوراک مہیا کرے اور اس کی طاقت سے زیادہ کام نہ لے۔ جانور بھی حسنِ سلوک کے مستحق ہیں۔ کسی جانور کے گھونسلے سے اس کے بچے اٹھا لینا سخت گناہ کا کام ہے۔ ان بچوں کے ماں باپ کو اسی طرح تکلیف ہوتی ہے جس طرح انسان کو اس کے بچے کی گمشدگی پر ہوتی ہے۔ جانوروں پر ظلم کرنے سے سختی سے روکا گیا ہے۔ وہ بھی خدا کی مخلوق ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”رحمت کا مادہ تو صرف بدبخت کے دل سے نکالا جاتا ہے۔“ (جامع ترمذی)

بھوکے کو کھانا کھلانا اس قدر ضروری ہے کہ جب جہنمیوں سے پوچھا جائے گا کہ تمہیں کون سی چیز دوزخ میں لے گئی تو ان کے جواب میں یہ بات بھی شامل ہوگی: ﴿وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ﴿٤٤﴾﴾ (المدثر) ”اور ہم مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے۔“ خواہ جانور ہو یا انسان‘ ہر کسی کو بھوک کے وقت پیٹ بھرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک شخص نادار تھا۔ وہ کسی نیک آدمی

کے پاس یہ شکایت لے کر گیا کہ میری روزی تنگ ہے۔ اللہ کے اُس نیک بندے نے اسے کہا کہ تمہاری غربت دور ہو جائے گی تم بھوکوں کو کھانا کھلایا کرو۔ یہ سن کر وہ حیران ہوا کہ میں تو خود محتاج ہوں‘ بھوکوں کو کھانا کہاں سے کھلاؤں! اس نیک آدمی نے جواب میں کہا: اگر انسانوں کو نہیں کھلا سکتے تو پرندوں کو دانہ دنکا ڈال دیا کرو۔ چنانچہ اس نادار نے یہ عمل شروع کیا تو اس کی روزی میں برکت ہونے لگی۔

دنیا میں کچھ لوگ آسودہ حال ہوتے ہیں‘ جو غریب لوگوں سے مزدوری کرواتے ہیں۔ ایسی صورتِ حال میں رسول اللہ ﷺ کا حکم یہ ہے کہ جس کسی سے مزدوری کروائی جائے اُس کی مزدوری اس کا پسینا خشک ہونے سے پہلے ادا کر دی جائے۔ یہ اس کا حق ہے۔ جسمانی محنت مزدوری کرنے والے لوگ غریب ہوتے ہیں۔ مزدوری کروانے والے بعض لوگ ایسے ظالم ہوتے ہیں کہ وہ فوری معاوضہ نہیں دیتے بلکہ ان کے ساتھ وعدے کیے جاتے ہیں۔ بعض تو اپنی طاقت کے بل بوتے پر ان کی مزدوری دبا لیتے ہیں۔ اللہ کے بندوں کے ساتھ ایسا سلوک کرنا سراسر ظلم ہے۔

مخلوق کے ساتھ بھلائی کرنا اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔ وہ لوگ جو مزدوروں اور غریبوں کی کمزوری سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ان پر ظلم کرتے ہیں‘ ان سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے۔ نادار اور غریب بھی اسی طرح اللہ کے بندے ہیں جس طرح خوش حال لوگ۔ یہ اللہ کی حکمت ہے کہ اس نے کسی کو دولت مند بنایا اور کسی کی روزی تنگ رکھی۔ اسی طرح کسی کو عزت دی اور کسی کو کمزور رکھا۔

خاندان کے سربراہ کو اپنے اہلِ خانہ سے ہمدردی‘ خیر خواہی اور محبت ہوتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوق سے محبت ہے۔ انسان کو برے بھلے کی تمیز ودیعت کر دی گئی ہے۔ نیکی کرنے اور بدی سے رکنے کا حکم دیا ہے۔ یہ بتا دیا گیا ہے کہ ہر انسان کو اپنے اعمال کا حساب دینا ہوگا‘ جس کے نتیجے میں نیک بندوں کو جنت ملے گی جبکہ نافرمان طرح طرح کے عذابوں میں مبتلا کیے جائیں گے۔ یہ زندگی مرنے کے بعد ہوگی اور ابدالآباد ہوگی۔ قرآن مجید میں صاف صاف بتا دیا گیا ہے کہ عقل مند وہ ہے جو اس دنیاوی زندگی میں ایسے کام کرے جو آخرت کی زندگی میں اس کے لیے کامیابی اور کامرانی کا باعث بنیں۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر حد درجہ مہربان ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ کوئی انسان عاقبت کی سزا نہ پائے۔ چنانچہ ہر انسان پر نیکی اور برائی کا تصور واضح کر دیا گیا ہے۔ اس کو اچھے اور برے نتائج

سے آگاہ بھی کر دیا گیا ہے۔ انسان کے ساتھ خالق کی ہمدردی کا یہ عالم ہے کہ اس نے انسانوں کی ہدایت کے لیے اپنے برگزیدہ بندے بھیجے جنہوں نے انسانوں کو صراطِ مستقیم سے آگاہ کرتے ہوئے اس کا عملی نمونہ بھی پیش کیا۔ اس کے باوجود انسانوں کی کثیر تعداد دنیاوی زندگی پر فریفتہ ہوگئی۔ جو انسان دنیا کی زندگی کے دھوکے میں آکر برا کام کر بیٹھتا ہے اگر وہ اللہ تعالیٰ سے سچے دل کے ساتھ معافی مانگ لے تو وہ مہربان معاف کر دیتا ہے۔ اگر برائیاں کرنے کے بعد انسان صمیمِ قلب کے ساتھ اپنے گناہوں پر پچھتائے‘ معافی کی دعا کرے اور برائیاں چھوڑ دے تو اللہ تعالیٰ نہ صرف اس کی برائیاں معاف کر دے گا بلکہ اس کے گناہوں کو نیکیوں میں بدل دے گا۔ اللہ تعالیٰ غفور و رحیم اور مہربان ہے‘ وہ تو ہمہ وقت معاف کرنے کو تیار ہوتا ہے۔ وہ اس بندے سے خوش ہوتا ہے جو اپنے گناہوں کا اعتراف کر کے مغفرت طلب کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو ایسے انسانوں کو بھی بخش دیا جنہوں نے زندگی میں کوئی بھی نیک کام نہ کیا مگر آخری وقت اللہ سے ڈرنے کا خیال آیا اور برے کام سے باز آگئے۔ رسول اللہ ﷺ کی زبان سے کئی ایسے انسانوں کا ذکر سنا گیا اور قرآن کی تعلیم میں بھی یہ مذکور ہے۔

دنیا میں انسانوں کے بنائے ہوئے کتنے ہی مذاہب یا ازم ہیں جن کو لوگ مانتے ہیں۔ ان کو کامل نہیں کہا جا سکتا۔ اسی طرح کچھ الہامی مذاہب ہیں مگر ان میں تحریف ہو چکی ہے۔ صرف اسلامی تعلیمات ہی قابلِ بھروسا ہیں‘ کیونکہ ان کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے خود لیا ہے۔ یہ فیصلہ کر دیا گیا ہے کہ ﴿اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ ۟﴾ (آل عمران: ۱۹) ”اللہ کے نزدیک دین (طرزِ زندگی) تو بس اسلام ہے۔“ اس کی تعلیمات میں مخلوقِ خدا کے ساتھ ہمدردی اور بھلائی کی تعلیم دی گئی ہے جس کی مثال کسی اور طرزِ زندگی میں نہیں ملتی۔ یہ اسلامی تعلیم ہی ہے جس کے ماننے والوں نے خود تکلیف اٹھا کر دوسرے ضرورت مندوں کی مدد کی اور اپنی ضرورت پر دوسروں کی ضرورت کو ترجیح دی۔ اسلام کی تاریخ میں اس طرح کی مثالیں کثرت کے ساتھ ملتی ہیں۔ خالق کو چونکہ حسنِ اخلاق پسند ہے‘ لہٰذا یہی درست ہے۔ صرف اپنے ذاتی مفاد کو پیش نظر رکھنا اور دوسروں کی تکلیف اور ضرورت کا احساس نہ کرنا بداخلاقی ہے۔ اسلام کی تعلیم تو یہ ہے کہ جو شخص جانتا ہو کہ اس کا ہمسایہ بھوکا سویا ہے تو اگرچہ وہ عبادت میں مصروف رہے‘ وہ (سچا) ایمان والا نہیں۔

❀❀❀

موجودہ دور میں اہلِ ایمان کی ذِمّہ داری

ممتاز ہاشمی

اللہ‘ اُس کے رسولوں‘ اُس کی نازل کردہ تمام کتابوں‘ غیب‘ قیامت اور آخرت کے دن پر کامل یقین ہر مسلمان کے ایمان کا بنیادی اور لازمی جزو ہے۔ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ پر ایمان کا تقاضا قرآن حکیم میں یوں بیان کیا گیا ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَطِیۡعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَ لَا تُبۡطِلُوۡۤا اَعۡمَالَکُمۡ ۝۳۳﴾ (محمد)

”اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو برباد نہ کرو۔“

﴿وَ مَا خَلَقۡتُ الۡجِنَّ وَ الۡاِنۡسَ اِلَّا لِیَعۡبُدُوۡنِ ۝۵۶﴾ (الذاریات)

”میں نے جنّات اور انسانوں کو محض اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ صرف میری عبادت کریں۔“

اگرچہ اللہ تعالیٰ تمام کائنات کا خالق ہے اور تمام مخلوقات اس کی تابع ہیں لیکن یہاں پر صرف انسانوں اور جنّوں ہی کو مخاطب کیا گیا ہے۔ اس بات سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کائنات میں انسان اور جنّ کے علاوہ کسی بھی مخلوق کو یہ آزادی نہیں دی گئی ہے کہ وہ اپنی مرضی اختیار کر سکے۔ انسانوں اور جنّوں کو اس بات کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہیں تو خالقِ کائنات کی بندگی اختیار کریں یا پھر کسی اور کی۔ اس اختیار کی وجہ اور ان کے عمل کی بنیاد پر ہی قیامت کے دن ان کا حساب ہوگا۔ ابدی زندگی میں کامیابی اور ناکامی کا دارومدار اور معیار اسی بندگی پر محیط ہوگا۔ اس لیے اس زندگی میں کامیابی کا انحصار صرف اور صرف اللہ کی بندگی میں پنہاں ہے۔ یہ وضاحت بہت ضروری ہے کہ بندگی کا تعلق صرف عبادات تک محدود نہیں جو بندگی کا محض ایک حصہ ہیں‘ بلکہ بندگی کا حقیقی تصور اللہ کے تمام احکام کی ہمہ وقت پابندی اور عمل داری ہے۔ اس کا واحد راستہ تمام خلافِ شریعت احکام کو ختم کرنے اور دین اسلام کے نفاذ کی جدوجہد میں پنہاں ہے۔

اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ کی اطاعت کا مطلب یہ ہے کہ ان تمام احکامِ الٰہی پر

جو بذریعہ وحی پیغمبر آخرالزماں محمد ﷺ کی وساطت سے اُمّتِ مُسلمہ کو پہنچائے گئے‘ ایسے مکمل عمل درآمد کرنا جس طرح سے محمد ﷺ نے بتایا اور جو سُنّتِ رسول ﷺ کی صورت میں محفوظ ہیں۔

آج دنیا تیزی سے اپنے اختتام کی جانب گامزن ہے۔ اس دور میں اہلِ ایمان کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہوجاتا ہے کہ وہ اپنے ایمان کی تجدید کے ساتھ اپنے عمل صالح کو مستحکم بنانے کی کوشش کریں۔ موجودہ صورتِ حال کو سمجھنے کے لیے ذیل کی احادیث کو سامنے رکھنا ضروری ہوگا۔

امام احمد بن حنبل ؒ نے حضرت نعمان بن بشیر ؓ سے روایت کیا ہے کہ آنحضور ﷺ نے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے مخاطب ہوکر فرمایا:

’’تمہارے مابین نبوت موجود رہے گی (آپ ﷺ کا اشارہ خود اپنی ذاتِ اقدس کی جانب تھا) جب تک اللہ چاہے گا‘ پھر جب اللہ چاہے گا اسے اٹھالے گا۔ اس کے بعد نبوت کے طریقے پر خلافت قائم ہوگی اور یہ بھی رہے گی جب تک اللہ چاہے گا کہ قائم رہے‘ پھر جب اللہ چاہے گا اسے بھی اٹھالے گا۔ پھر کاٹ کھانے والی (یعنی ظالم) ملوکیت آئے گی اور وہ بھی رہے گی جب تک اللہ چاہے گا‘ پھر جب اللہ چاہے گا اسے بھی اٹھالے گا۔ پھر مجبوری کی ملوکیت (غالباً مراد ہے مغربی استعمار کی غلامی) کا دور آئے گا اور وہ بھی رہے گا جب تک اللہ چاہے گا‘ پھر جب اللہ چاہے گا اسے بھی اٹھالے گا‘ اور پھر دوبارہ نبوت کے طریق پر خلافت قائم ہوگی!‘‘

راوی کے قول کے مطابق اس کے بعد آپ ﷺ نے خاموشی اختیار فرمالی۔ اس حدیث کی ایک دوسری روایت میں صراحت ہے کہ جب وہ نظام دنیا میں دوبارہ قائم ہوجائے گا تو آسمان بھی اپنی ساری برکات نازل فرمادے گا اور زمین بھی اپنی تمام برکتیں باہر نکال کر رکھ دے گی۔

اس کے علاوہ دو اور احادیث بہت اہم ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اب جو خلافت علیٰ منہاج النبوت کا نظام قائم ہوگا وہ پورے عالمِ انسانیت اور کُل روئے ارضی کو محیط ہوگا۔ چنانچہ:

(۱) صحیح مسلمؒ میں حضرت ثوبان ؓ (آنحضور ﷺ کے آزاد کردہ غلام) سے مروی ہے کہ

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

’’اللہ نے میرے لیے پوری زمین کو سمیٹ یا سکیڑ دیا۔ چنانچہ مَیں نے اس کے سارے مشرق بھی دیکھ لیے اور تمام مغرب بھی‘ اور سن رکھو کہ میری اُمّت کی حکومت ان تمام علاقوں پر قائم ہوکر رہے گی جو مجھے سکیڑ کر یا لپیٹ کر دکھادیے گئے!‘‘

(۲) مسند احمد بن حنبلؒ میں حضرت مقداد بن الاسود ؓ سے روایت ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا:

’’کُل روئے ارضی پر نہ کوئی اینٹ گارے کا بنا ہوا گھر باقی رہے گا نہ اونٹ کے بالوں سے بنا ہوا خیمہ جس میں اللہ کلمۂ اسلام کو داخل نہ کردے‘ خواہ کسی عزّت کے مستحق کے اعزاز کے ساتھ اور خواہ کسی مغلوب کی مغلوبیت کے ذریعے۔ یعنی یا تو اللہ انہیں عزّت دے گا اور اہلِ اسلام میں شامل کردے گا یا انہیں مغلوب کردے گا‘ چنانچہ وہ اسلام کی بالادستی قبول کرلیں گے!‘‘

حضرت مقداد ؓ فرماتے ہیں کہ اس پر میں نے (اپنے دل میں) کہا کہ تب وہ بات پوری ہوگی (جو سورۃ الانفال کی آیت ۳۹ میں وارد ہوئی ہے) کہ دین کُل کا کُل اللہ ہی کے لیے ہوجائے!

آج کے حالات ان احادیث کی سچائی کی مکمل گواہی دیتے ہیں۔ اب کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں کہ ہم تیزی سے آخری دور کی جانب گامزن ہیں۔ اس دور میں قیامت سے پہلے پوری کائنات پر دین اسلام کا مکمل نفاذ ہوگا۔ ایمان اور عملِ صالح کے حامل مسلمانوں کو دنیا کی خلافت عطا ہوگی۔ نئی نسل کے لیے اس وقت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ مند ہونے کے بھرپور مواقع میسّر ہیں۔ وقت کو بہترین طور پر استعمال کرتے ہوئے وہ اپنی آخرت سنوارنے میں کامیاب ہوسکتے ہیں۔ یہ حقیقت اس عہد کے مجدد علامہ اقبال نے اپنی نگاہ سے دیکھ لی تھی اور اس انداز میں اہلِ ایمان کو پیغام دیا کہ ؎

وقتِ فرصت ہے کہاں‘ کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اِتمام ابھی باقی ہے!

علامہ اقبال کے نزدیک آج سب سے اہم کام دین اسلام کے نفاذ کے لیے اپنے آپ کو وقف کرنا ہے۔ اس طرح ہم اپنی تخلیق کے جواز کو صحیح ثابت کرنے اور آخرت میں کامیابی حاصل

کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ اپنے روز مرّہ کے معمولات اور مصروفیات کا جائزہ لے کر ہم اُخروی فلاح کی منصوبہ بندی کر سکتے ہیں۔ ہمیں یہ یقین ہونا چاہیے کہ اللہ کی راہ میں جدّوجُہد کر کے ہم کسی پر احسان نہیں کریں گے بلکہ اس میں ہمارا اپنا ذاتی مفاد ہے۔

نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ نے عالمی سطح پر اسلام کے نفاذ کے لیے عملی اقدامات اور جدّوجُہد کی بشارت دی تھی۔ یہ سارا لائحہ عمل سُنّتِ رسول ﷺ کی شکل میں ہمیشہ کے لیے ہماری رہنمائی کا ذریعہ ہے۔ اس عمل کے بنیادی اجزاء یہ ہیں:

۱) دعوتِ اسلام بذریعہ قرآن

۲) حزبُ اللہ (اللہ کی جماعت) کی تلاش اور اس کا حصہ بننا

۳) نظامِ باطل کے خلاف اور اقامتِ دین کی جِدّوجُہد

علامہ اقبال نے اس سنہرے مستقبل کے خدوخال کچھ یوں بیان کیے ہیں:

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی
شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے!

اللہ تعالیٰ ہم سب پر اپنا فضل وکرم کرے اور ہمیں اپنی صلاحیتیں اور توانائیاں اسلامی احکام کے نفاذ کے لیے مختص کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

(مندرجہ بالا مضمون کے ماخذ ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے دروس وخطابات ہیں۔)

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت و تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

افسوس کہ آج یوم تکبیر کے حوالے سے بس ٹوٹے پھوٹے، پھس پھسے، بے روح قسم کے بیانات جاری کر دیے جاتے ہیں جن میں حمیت اور غیرت کا کوئی عکس نظر نہیں آتا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اللہ کی طرف سے یہ جو دو تحفے ہیں ان کی قدر کی جائے۔

پاکستان نے جو کردار ادا کرنا ہے، اسے نبھایا جائے۔ ایک آزاد خارجہ پالیسی اپنائی جائے۔ اسماعیل ہنیہ کہہ رہے ہیں کہ اگر پاکستان کی طرف سے صرف دھمکی بھی دے دی جائے تو یہ اسرائیل کو روکنے کے لیے کافی ہوگی۔ ظاہر ہے کہ اس کے لیے ہمت اور جرأت کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ ہماری تکبیر مُلّا کی نہیں، مجاہد کی ہونی چاہیے۔ اس کا علی الاعلان اظہار کرنا چاہیے۔ اس حوالے سے تنظیم اسلامی نے اپنی حد تک بھرپور آواز بلند کی ہے۔ ہمارے بس میں جو ہے وہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

عوام سے بھی اپیل ہے کہ اسرائیل کے خلاف جہاں بھی مظاہرے ہو رہے ہوں اس میں حصہ لینے کی کوشش کریں۔ اسرائیل کو سپورٹ کرنے والی کمپنیوں کی مصنوعات کا بائیکاٹ کیا جائے۔ حماس کی مالی امداد کی جائے۔ خطباتِ جمعہ، سیمینارز اور دوسرے عوامی پروگراموں کے ذریعہ اس موضوع کو زندہ رکھا جائے۔ سب سے بڑھ کر دعاؤں خصوصاً قنوتِ نازلہ کا اہتمام کیا جائے۔ ہم نے بہرحال اپنے حصے کا کام کرنا ہے۔ حق و باطل کی اس جنگ میں ہمیں درست سمت میں کھڑا ہونا ہے۔ قرآن وحدیث میں قیامت سے قبل آخری دور کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے، جو خبریں بیان کی گئی ہیں اس میں اس خطے یعنی پاکستان اور افغانستان کی بہت اہمیت ہے۔ یہیں سے وہ قافلے چلیں گے جو امام مہدی کی مدد کریں گے اور خراسان ہی سے کالے جھنڈے نکلیں گے جنہیں کوئی نہیں روک سکے گا۔ یہاں تک کہ وہ ایلیا یعنی بیت المقدس میں نصب کر دیئے جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ اُس وقت تک یہاں اسلامی نظام قائم ہو چکا ہوگا، تب ہی یہاں سے فوجیں جانا ممکن ہوگا۔ اس حوالے سے پاکستان کی خصوصی اہمیت ہے۔ یہ وطن جو ہمیں ملا ہے، یہ صرف زمین کا ایک ٹکڑا نہیں۔ ہندوستان میں کس چیز کی کمی تھی؟ کیا وہاں مساجد نہیں تھیں؟ مدارس نہیں تھے؟ کیا وہاں نمازیں نہیں پڑھی جاتی تھیں؟ روزے نہیں رکھے جاتے تھے؟ قائد اعظم کی ۱۰۱ تقاریر نکال کر دیکھ لیجیے، انہوں نے اسلام کی ''قوالی'' کی ہے۔ بہرحال ہم سب کی ذمہ داری ہے کہ تکبیرِ ربّ کے تقاضوں کو پورا کریں۔ اسی میں ہماری آخرت کی کامیابی بھی ہے اور دنیا کی کامیابی بھی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

July 2024
Vol.73

Regd. CPL No.115
No.7

Monthly **Meesaq** Lahore

جاری کردہ: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

جدید تعلیم یافتہ حضرات وخواتین کے لیے دینی علوم کے حصول کا نادر موقع

رجوع الی القرآن کورس

(دورانیہ ۹ ماہ)

عرصہ 42 سال سے باقاعدگی سے جاری تعلیم

مضامینِ تدریس

پارٹ ۱ (سالِ اوّل) برائے مرد وخواتین

- تجوید و ناظرہ
- عربی گرائمر (صرف ونحو)
- ترجمہ قرآن (مع تفسیری ولغوی توضیحات)
- دورہ ترجمہ قرآن
- قرآن حکیم کی فکری و عملی رہنمائی
- سیرت وشمائل النبی ﷺ
- مطالعہ حدیث واصطلاحاتِ حدیث
- فکرِ اقبال
- فقہ العبادات
- معاشیاتِ اسلام
- اضافی محاضرات

پارٹ ۲ (سال دوم) برائے مرد حضرات

- عربی زبان وادب
- اصولِ تفسیر
- تفسیر القرآن
- اصولِ حدیث
- درسِ حدیث
- اصول الفقہ
- فقہ المعاملات
- عقیدہ (طحاویہ)
- اضافی محاضرات

☆ رجسٹریشن یکم رمضان سے شروع ہے۔ ☆ انٹرویو 02 ستمبر
آغاز کلاسز 03 ستمبر 2024ء (ان شاء اللہ)

ایامِ تدریس: پیر تا جمعہ

اوقاتِ تدریس: صبح 8:15 بجے تا 12:50

نوٹ: بیرونِ لاہور رہائشی صرف مرد حضرات کے لئے ہاسٹل کی محدود سہولت موجود ہے۔ ہاسٹل میں پہلے آئیے پہلے پائیے کے اصول پر رہائش دی جاتی ہے لہذہ خواہشمند حضرات پہلے سے رجسٹریشن کروالیں۔

ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی خدماتِ قرآنی کا مرکز — قرآن اکیڈمی
36-K ماڈل ٹاؤن لاہور
email:irts@tanzeem.org
www.tanzeem.org

زیرِ انتظام: مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور (رجسٹرڈ) — مزید تفصیلات کے لئے www.tanzeem.org
03161466611 - 04235869501-3